غزلوں میں تاریخ نگاری

کا آغاز و ارتقا

محمود الحسن

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دھلی

عربوں میں تاریخ نگاری

کا

آغاز اور ارتقا

محمود الحسن

ذخیرہ محمد وقار المجید

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Marfat.com

© محمود الحسن ۱۹۷۵

135001

صدر دفتر :-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دلّی 110025

شاخیں :-

اُردو بازار۔ دہلی —— 110006

پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

قیمت :- پندرہ روپے

(نعمانی پرنٹنگ پریس۔ دہلی)

فہرست

	احوال واقعی	۵
پہلا باب	عربوں کے عہدِ قدیم پر ایک نظر	۹
دوسرا باب	مغازی اور سیرۃ نگاری کا آغاز	۳۵
تیسرا باب	فتوح و احداث نگاری کا دور	۱۱۹
چوتھا باب	عالمی تاریخ نگاری کا مرحلہ	۱۶۵
پانچواں باب	فکروفن : ایک جائزہ	۳۰۴
کتابیات		۳۲۰

احوال واقعی

کسی کتاب کے شروع میں کچھ لکھنا خواہ وہ کسی عنوان سے ہو ایک خوشگوار موقع ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بھی چند باتیں ناظرین کے لیے تحریر کرتا ہوں۔ کوئی دس سال گزرے جب عربوں کی تاریخ نگاری کے موضوع پر کچھ لکھنے کا خیال پہلی بار میرے ذہن میں آیا تھا۔ اس کی تحریک خود میرے مقالے کی نوعیت تھی جس کو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی، ڈگری کے لیے لکھ رہا تھا۔ اس کا عنوان تاریخ اسلام کے ایک نامور مورخ ابن الاثیر کی کتابوں سے متعلق تھا۔ اس کی مشہور کتاب "تاریخ الکامل" کے مآخذ کی تلاش، تحقیق اور تجزیے کے دوران پہلی بار میں نے سوچا کہ کیوں نہ عرب تاریخ نگاری کی تاریخ اردو زبان میں لکھی جائے۔ اس کے بعد اس موضوع پر انگریزی اور عربی میں چند کتابیں بھی نظر سے گزریں، انھیں پڑھ کر کچھ اور ہمت بڑھی۔ اس کے بھی دو اسباب تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان میں توازن اور اعتدال کی روح نمایاں طور پر کم پائی جاتی ہے۔ اگر روزنتھال کی کتاب ان فکری لہروں کو پانے اور انھیں بیان کرنے کی ایک عالمانہ کوشش ہے جو ان کے خیال میں عرب تاریخ نگاری کے پس پردہ کارفرما تھیں مگر جس میں استشہاد کی کمی ہے تو دوسری طرف عربی زبان میں لکھی گئی کتابوں میں وہ تجزیاتی و تنقیدی عنصر کم پایا جاتا ہے جو مارگولیتھ اور روزنتھال کی کتابوں کی خصوصیات ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہوئی کہ اس موضوع پر اس وقت تک اردو زبان میں کوئی کتاب میرے علم کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ دونوں اسباب تھے جن کی بنا پر میں نے اس نازک اور اہم کام کو انجام دینے کا ارادہ کر لیا۔

ہفتے اور مہینے گزرتے گئے میں اس کام کے لیے بھی اکثر انھیں مآخذ سے مواد اکٹھا کرتا گیا جنھیں اپنے تحقیقی منصوبے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ گویا مجھے اس دوسرے

Marfat.com

احوال واقعی

کسی کتاب کے شروع میں کچھ لکھنا خواہ وہ کسی عنوان سے ہو ایک خوشگوار موقع ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بھی چند باتیں ناظرین کے لیے تحریر کرتا ہوں۔ کوئی دس سال گزرے جب عربوں کی تاریخ نگاری کے موضوع پر کچھ لکھنے کا خیال پہلی بار میرے ذہن میں آیا تھا۔ اس کی تحریک خود میرے مقالے کی نوعیت تھی جس کو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی، ڈگری کے لیے لکھ رہا تھا۔ اس کا عنوان تاریخ اسلام کے ایک نامور مورخ ابن الاثیر کی کتابوں سے متعلق تھا۔ اس کی مشہور کتاب "تاریخ الکامل" کے مآخذ کی تلاش، تحقیق اور تجزیے کے دوران پہلی بار میں نے سوچا کہ کیوں نہ عرب تاریخ نگاری کی تاریخ اُردو زبان میں لکھی جائے۔ اس کے بعد اس موضوع پر انگریزی اور عربی میں چند کتابیں بھی نظر سے گزریں، انھیں پڑھ کر کچھ اور ہمت بڑھی تھا۔ اس کے بھی دو اسباب تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ان کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان میں توازن اور اعتدال کی روح نمایاں طور پر کم پائی جاتی ہے۔ اگر اوزنتھال کی کتاب ان فکری لہروں کو پانے اور انھیں بیان کرنے کی ایک عالمانہ کوشش ہے جو ان کے خیال میں عرب تاریخ نگاری کے پس پردہ کارفرما تھیں مگر جس میں استشہاد کی کمی ہے تو دوسری طرف عربی زبان میں لکھی گئی کتابوں میں وہ تجزیاتی و تنقیدی عنصر کم پایا جاتا ہے جو مارگولیتھ اور اوزنتھال کی کتابوں کی خصوصیات ہیں۔ دوسری اہم وجہ یہ ہوئی کہ اس موضوع پر اس وقت تک اُردو زبان میں کوئی کتاب میرے علم کے مطابق نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ دونوں اسباب تھے جن کی بنا پر میں نے اس نازک اور اہم کام کو انجام دینے کا ارادہ کرلیا۔

ہفتے اور مہینے گزرتے گئے۔ میں اس کام کے لیے بھی اکثر انھیں مآخذ سے مواد اکٹھا کرتا گیا جنھیں اپنے تحقیقی منصوبے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ گویا مجھے اس دوسرے

Marfat.com

غزلوں میں تاریخ نگاری

کا آغاز و ارتقا

محمود الحسن

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Marfat.com

Marfat.com

کرنے والی لڑکیوں کی زبان پر مدینہ کی گلیوں میں گونج رہے تھے۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوِدَاع
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعٰی لِلّٰہِ دَاع

ان ابتدائی نعتیہ اشعار سے بوصیری کے "قصیدہ بردہ" فارسی میں جامی، رومی، سعدی، عراقی، قدسی اور اردو میں وجہی اور ولی دکنی سے دورِ جدید تک نعت نے مختلف جغرافیائی سیاسی اور معاشرتی حالات کے تحت ایک طویل سفر طے کیا ہے جس میں مسلمان شعرا کے علاوہ بہت سے غیر مسلم شعرا بھی شامل ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں محسن کاکوروی، عرش ملسیانی، دلو رام کوثری (جو بعد میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے) گرامی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے بے شمار شعرا کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ جنہوں نے نعت کے وسیلے سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

ان ہی نعت گو شعرا میں جناب راسخ عرفانی کا نام شامل ہے، جن کا نعتیہ کلام اور قومی و ملی نظمیں اس مجموعہ میں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ نعتیں جہاں شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، وہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے شاعر کی بے پناہ عقیدت کی ترجمان ہیں ___ اظہارِ عشق و عقیدت

Marfat.com

کام کے لیے مزید محنت اس وقت تک نہیں کرنی پڑی جب تک کہ میری اصل کتاب تیار نہیں ہوگئی۔ کوئی تین سال یہ دونوں کام متوازی خطوط پر چلتے رہے۔ غالباً ۱۹۶۶ء میں میرا مقالہ صبر آزما مراحل سے گزر کر ممتحین کے حوالے ہوگیا لیکن میری یہ کتاب ابھی خام مواد ہی پر مشتمل تھی۔ دوران تحقیق مجھے یو۔ جی۔ سی کا وظیفہ جس کی مدت تین سال تک تھی ملتا رہا۔ لیکن اس کے ختم ہونے پر یونیورسٹی میں قیام کرنا بغیر کسی مالی ذریعے کے خاصا مشکل تھا۔ تاہم میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک لیجا کر ہی دم لوں گا۔ اپنے وطن اور علی گڑھ کے مابین تقریباً دو سال تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ چکّر لگاتا رہا اور اس مرحلہ کی غیر مسلسل محنت کے بعد اس کا پہلا مسودہ تیار ہوا اور بکھرے ہوئے بہت سارے مواد میں ایک ربط پیدا ہوا۔ پی، ایچ، ڈی کی ڈگری منظور ہو جانے اور مل جانے کے بعد علی گڑھ جانے کا کوئی جائز سبب بھی باقی نہ رہا۔ یہ مسودہ پھر یوں ہی پڑا رہا۔

چند ماہ بعد اشاعت کے لیے ایک مشہور ادارے کی طرف رجوع کیا۔ نمونے کے لیے ایک حصہ بھی بھیج دیا مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ سب سے کٹھن اگر کوئی مرحلہ ہو سکتا ہے تو یہی یعنی کتاب کی اشاعت کا۔ جواب آیا کہ موضوع نیا ہے اور بہت اہم، خود یہ ادارہ اس موضوع پر ایک کتاب اردو زبان میں تیار کرانا چاہتا تھا لیکن کوئی ڈھب کا آدمی اس کام کے لیے نہ مل سکا۔ آپ کا کام بہت پسند آیا لیکن افسوس یہ ہے ہم اس کی اشاعت سے معذور ہیں۔

حسن اتفاق کہیے کہ عارضی طور پر مجھے رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں مدیر معاون کی جگہ مل گئی اس طرح دہلی میں کوئی چودہ مہینے بڑے اطمینان سے گزرے۔ رسالے کے پہلے دو شماروں میں اس کتاب کا ایک حصہ شائع بھی ہوا۔ اس کی اشاعت سے وہ اعتماد دوبارہ لوٹ آیا جو پبلشر کے بزرگانہ سلوک سے مجروح ہوگیا تھا۔ دہلی میں اس کتاب کی اشاعت کا دوبارہ خیال پیدا ہوا اور حوصلہ کر کے ایک کاتب سے بات چیت بھی کرلی۔ میں اب اس فکر میں رہا کہ کسی صورت سے کوئی ڈیڑھ ہزار روپیہ جمع کروں جو اس منصوبے کی مجموعی لاگت تھی۔ لیکن اچانک مجھے دلّی سے علحدہ ہونا پڑا اور

اپنی معاش کے لیے پھر فکر لاحق ہوئی۔

اتفاق دیکھیے کہ ملازمت کی خاطر ایسی جگہ آنا پڑا جو پہلے کبھی میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی یعنی پنجاب کی ایک پرانی سکھ ریاست کے صدر مقام پٹیالہ پہنچ گیا۔ اس طرح غالباً مئی ۱۹۷۰ء میں پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ مذہبیات سے وابستہ ہوگیا۔ یہ دلچسپ اتفاق تھا اور بڑا ہی معنی خیز بھی۔ اس حقیقت کا ادراک چار سال گزرجانے کے بعد بڑھتا ہی جاتا ہے۔ بہرحال کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی میں اتفاقات کا بڑا دخل ہوتا ہے لیکن ایسی زندگی شاید امید ومایوسی کی ایک مسلسل آماجگاہ بن جاتی ہے۔

خیر، یہاں پہنچ کر پھر میں نے مسودے پر پورے اطمینان وسکون کے ساتھ ایک اور نظر ڈالی، زبان وبیان میں کافی اصلاح کی اور مواد میں حذف واضافہ کیا۔ معاملہ پھر کاتب کا سامنے آیا، ایک نئے کاتب سے معاملہ ہوا جنھوں نے حسب وعدہ مقررہ مدت میں کتابت مکمل کرکے مجھے دیدی لیکن اس دوران کاغذ بازار سے نایاب ہوچکا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو اس کا نرخ کئی گنا آگے جاچکا تھا۔ اب میرے لیے اس کتاب کی اشاعت کا مسئلہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگیا۔ تاہم ہمت کرکے دیگر ذرائع کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچا کیوں نہ ایک آدھ پبلشر سے خط وکتابت کی جائے شاید کوئی تیار ہی ہوجائے۔ اسی امید وبیم کے ساتھ ایک خط منیجر صاحب مکتبہ جامعہ کو بھی لکھ دیا۔ جواب آیا اور معقول جواب۔ مسودہ طلب کیا گیا تھا، اس خیال کے تحت کہ مکتبے کی لٹریری کمیٹی اس پر غور کرنے کے بعد ہی فیصلہ کرے گی۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور کوئی سات ماہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ کمیٹی نے اشاعت کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔ سوچتا ہوں یہ کیسے ہوا۔ کیا میری لگاتار محنت، صبر آزما جدوجہد کا یہی حقیقی اور منطقی نتیجہ ہونا چاہیے تھا یا یہ بھی محض ایک اتفاق ہے یا دوسرے لفظوں میں تائید الٰہی، غالباً اسی راز کو سلجھانے کی کوشش میں تاریخ انسانی وجود میں آتی ہے۔

Marfat.com

بہرحال میں ان سب کا شکرگذار ہوں جنہوں نے کسی طرح سے بھی اس کتاب کی تکمیل میں براہ راست یا بالواسطہ تعاون کیا ہے۔ اس موقع پر مجھے مولانا آزاد لائبریری میں اورنٹیل سیکشن کے وہ حافظ صاحب یاد آتے ہیں جو ہیں تو معمولی پڑھے لکھے مگر عربی کتابیں ان کی نوک زبان پر ہیں۔ ان کے تعاون کا حال یہ تھا کہ جب میں کافی عرصے کے بعد اس کتاب کی کتابیات کی تیاری کے لیے علی گڑھ گیا تو انھوں نے متعلقہ کتابوں کی الماریوں کی کنجی میرے حوالے کردی۔ آخر میں بجا طور پر یہ میرا خوشگوار فرض ہے کہ مکتبہ جامعہ اور مینجر صاحب مکتبہ جامعہ کو نہ بھولوں جن کی دل چسپی سے میری یہ حقیر کاوش منظر عام پر آنے کے قابل ہو سکی۔

محمود الحسن

شعبۂ مذہبیات پنجابی یونیورسٹی

پٹیالہ

۱/۷۵ء

Marfat.com

پہلا باب

عربوں کے عہدِ قدیم پر ایک نظر

عربوں کے یہاں تاریخ نگاری کی نشو و نما کس طرح ہوئی اور یہ فن ترقی کے کن مرحلوں سے گزرا، اس کا جائزہ لینا بعض بنیادی اسباب کی بنا پر خاصہ پیچیدہ مسئلہ ہے۔ تاہم اس موضوع پر جب مطالعہ شروع کیا جائے تو موضوع کی مناسبت سے یہ معلوم اور متعین کرنا ضروری ہے کہ لفظ "عرب" سے مراد کون لوگ ہیں۔ اس سوال پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ طے کرنا ہوگا کہ یہ لوگ کس خطۂ زمین پر آباد رہے ہیں۔ ان دو باتوں کو طے کر لینے کے بعد ہی ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔

عرب علماء انساب اس نظریے کے قائل ہیں کہ عرب نسلی طور پر دو اشخاص عدنان اور قحطان کی اولاد ہیں۔ بعض قحطان کو اسماعیل کی اولاد کہتے ہیں جو مشکوک ہے اور بعض قحطان کو سام بن نوح کی اولاد سے مانتے ہیں۔ ایک تیسرے شخص قضاعۃ کا بھی ذکر ملتا ہے جسے بعض معد بن عدنان اور بعض

Marfat.com

مالک بن حمیر سے منسوب کرتے ہیں۔ ابن حزم نے قضاعۃ کا جائے مسکن شام قرار دیا ہے۔[۲] اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اس کی نسل کے لوگ ختم ہو گئے اس طرح قضاعۃ کے ختم ہونے سے قحطان و عدنان کی اولاد باقی رہی جن سے جزیرۃ العرب آباد ہوا۔ قحطان کی اولاد جنوبی عرب کے زرخیز علاقے یمن میں اور عدنان کی اولاد شمالی عرب میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ تاریخ کے سفر میں قبیلوں کی شکل میں بٹتے رہے اور کیا عجب ہے کہ ان کے مابین اختلاط، امتزاج اور انضمام کا عمل بھی ہوتا رہا ہو۔ ان میں سے بعض بالخصوص قحطان کی اولاد نے آگے چل کر اپنے پیچھے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ نمونے بھی چھوڑے ہیں۔ اس کے بچے کھچے آثار یمن کے پہاڑوں محل کے کھنڈرات اور عظیم الشان ملبوں کی شکلوں میں موجود ہیں۔ یہ قدیم آثار ان کے حسنِ تخلیق، عزم بے پایاں اور بہت ہی قوی دماغ کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر جزیرۃ العرب اور اس کے پاس پڑوس عراق و شام کے اطراف میں آباد ہوتے رہے ہیں۔

عربوں میں تاریخ نگاری کی نشوونما کے موضوع پر تلاش و تحقیق کے کام میں دشواری اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ تحریری شکل میں اس موضوع پر جو کچھ تھوڑا مواد ہے بھی وہ اس دور سے متعلق ہے جو اسلام سے بہت ہی قریب کا زمانہ ہے۔ اسی لیے اس فن کی کوئی قدیم شکل متعین نہیں ہو پاتی۔ اسلام سے پہلے جو دَور گزرا ہے اس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ناقص، محدود اور غیر علمی ہیں۔ اس کے بارے میں جو اور جس نوعیت کا بھی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے وہ دراصل تحریری صورت میں بہت بعد میں لایا گیا ہے۔ اس کو منضبط کرنے سے پہلے

Marfat.com

عرب راوی اپنے دماغوں میں محفوظ اور اسے سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے جو بالآخر عہدِ اسلام کی ابتدائی صدی میں کسی حد تک ضبطِ تحریر میں آسکا۔

اس مرحلے پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ کہ کیا عرب اسلام قبول کرتے ہی تاریخی دور میں داخل ہوگئے؟ کیا اسلام سے پہلے وہ تاریخی کارناموں سے ناآشنا تھے؟ یہی نہیں اس سے آگے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی انسانی گروہ تہذیب و تمدّن کے میدان میں اچھل کر صدیوں کا فاصلہ سالوں میں طے کرلیتا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ ان سوالوں کا جواب مثبت میں دینا خاصہ مشکل ہے۔ یعنی یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ عرب بھی دوسری اقوام کی طرح ارتقاء کے فطری مرحلوں سے گزرے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی رفتار سست رہی ہو۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ عرب بھی اسلام کی آمد سے بہت پہلے تاریخی سرگرمیوں میں منہمک تھے۔ انھوں نے فتوحات کی تھیں اور سلطنتیں قائم کی تھیں۔ وہ قانون و اخلاق کے تصوّر اور اصولوں سے واقف تھے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں وہ نووارد نہ تھے بلکہ بعض اعتبار سے ان میدانوں میں وہ بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے ساحلوں پر بین البراعظمی تجارت کے لیے ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے ملاح، تاجر اور تجارتی بیڑے قدیم دنیا کی متمدن قوموں میں خاصے مشہور تھے۔ انھوں نے آب رسانی اور سینچائی کے بڑے بڑے منصوبوں کی تکمیل کی تھی جن کے آثار دیکھ کر ان کی اعلیٰ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی خوش حالی کا ذکر "ہیرڈوٹس" "ڈایڈورس" اور "اسٹریبو" کی کتابوں میں

Marfat.com

موجود ہے۔ ان کے سونے کی کانوں کا ذکر توراۃ میں آیا ہے۔ ڈائیڈورس نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ جزیرۃ العرب کے نباتات اور حیوانات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ شاید یہی بے پناہ دولت تھی جس کی بنا پر یونانیوں اور رومیوں نے اس کی سمت للچائی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جزیرۃ العرب پر اسکندر کے حملے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے۔ اسٹرابو جو خود بھی "آیس گالس" کے حملے میں شریک تھا، اس کے بیانات اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جزیرۃ العرب کے بعض حصّوں پر منظم سلطنت تھی جن پر بااقتدار خاندان حکمرانی کرتے تھے۔ اس سے ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تجارتی لین دین، بین الاقوامی معاہدوں، اندرونی نظم و نسق کے لیے کسی ایک زبان سے کام لیا ہوگا۔ اس زبان کے ذریعے اپنے خیالات، معاملات اور ضروریات پوری کرتے رہے ہوں گے۔ ایسا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ چنانچہ ہمیں ایک ایسی زبان کا پتہ چلتا ہے جو ان کے یہاں مروج تھی۔ مستشرقین اس زبان کو خط حمیری اور عرب اس کو خط مسند کا نام دیتے ہیں۔ اس تحریر کی صورت، اس کے دائرۂ اثر، عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف ناموں سے پکارے جانے کی لسانی بحث سے قطع نظر ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک ایسی زبان موجود تھی جو پورے جزیرۃ العرب میں نہ سہی تو بھی جنوبی حصّوں میں بولی اور لکھی جاتی تھی۔ اس گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک انسانی گروہ کے لیے متمدن کہلانے کی جو صفات، لوازمات اور معیار ہونا چاہیے وہ عربوں میں اسلام سے صدیوں پیشتر موجود تھیں مگر تعجّب اور حیرت یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی تحریر نہیں جس کے بارے میں پورے استدلال سے یہ

Marfat.com

کہا جاسکے کہ اس کو ایک متمدن انسانی گروہ نے اپنے تمدّنی کارناموں کو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑا ہے۔ تاریخ میں یہ ایسا عقدہ ہے جسے جدید ذرائع تحقیقات ہی حل کر سکتے ہیں۔ بڑی مسرّت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور طبقات الارض نے اپنی انتھک کوششوں تجسس انگیز لیاقتوں اور اپنی مہم جوئیوں کے ذریعے خاصی معلومات ہمارے سامنے پیش کی ہیں جن کی مدد سے جزیرۃ العرب کی قدیم تاریخ کے متعدد گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی شخص قدیم عرب کی تاریخ معلوم کرنا چاہے تو اسے کئی ماخذ سے استفادہ کرنا ہوگا۔ مثلاً ان قوموں کی قدیم تاریخ جاننی ہوگی جو عربوں کی ہمسایہ تھیں بالخصوص ایرانیوں کی قدیم تاریخ کے ان پہلوؤں سے مدد لینی ہوگی جن سے عربوں کا براہِ راست تعلق تھا۔ اس سلسلے میں پہلوی زبان کی کتابوں اور کتبات سے مفید مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ عراق میں قائم اشوری سلطنت کے کتبات کے ذریعے قدیم عرب کے بعض سیاسی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے ذریعے عرب قبائل اور ان کے سرداروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شام کی سرحدوں پر آباد عربوں کے بارے میں معلومات ہمعصر قوموں کی تاریخ سے ملتی ہیں۔ یونانی اور رومن مورخین کی کتابوں میں جزیرہ العرب سے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا تعلق تیسری صدی قبلِ مسیح سے ہے۔ قابلِ ذکر مصنفین میں "ہیروڈوٹس" "وائیڈورس سسلس" اور "اسٹریبو" شامل ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رو مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں جزیرہ العرب کا کسی قدر تفصیل سے ذکر آیا ہوگا۔

Marfat.com

عربوں کی تاریخ کے سلسلے میں ان کتبات اور نقود کی زبردست اہمیت ہے جو صدرِ اسلام میں متعدد مقامات پر کثرت سے پائے جاتے رہے ہیں۔ ان کی مزید تلاش و تحقیق میں جدید مستشرقین نے حیرت انگیز محنت اور صبر سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ان تمام کتبات کو انھوں نے بڑی تحقیق، تشریح اور یقین کے ساتھ دو ضخیم کتابوں میں جن کے نام یہ ہیں:

1. REPORLOIR DEPIGRAPHIC SEMITIQNE.

2. CORPUS IMSCRIPTIONUN SEMITICARUN.

محفوظ کر دیا ہے۔

ہماری معلومات کا ایک اہم ذریعہ وہ قصص و اساطیر ہیں جنھیں اہل عرب اپنے حافظے کی مدد سے محفوظ رکھتے اور سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرتے رہے ہیں۔ اس مواد کی، ظاہر ہے وہ حیثیت نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مکمل طور پر تاریخی مواد مان لیا جائے۔ کیونکہ اس میں جذبہ، تخیل اور اختراع کا بڑا حصّہ ہے۔ عربوں نے اس میں بتدریج کافی اضافہ کیا ہے۔ ایسا مواد دَورِ جاہلی میں بڑی کثرت سے پیدا ہوا اور صدرِ اسلام میں بعض سیاسی و تہذیبی اسباب کی بنا پر اس میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس حقیقت کے باوجود یہ بات بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ قوموں کی ابتدائی تاریخ میں ایسے حصّے ضرور ملتے ہیں جو اپنی بنیادی خصوصیت کی بنا پر اساطیری درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر قابلِ قدر تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے کسی قوم کے مزاج، معیارِ فکر، رجحان اور رہن سہن پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مواد کسی قوم کی تاریخ مرتب کرتے وقت بطور مواد کے کام آتا ہے اور اسی کی خمیر سے تاریخ کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایران کی قدیم تاریخ لکھتے وقت فردوسی کا شاہنامہ، ہندوستان

Marfat.com

کی قدیم تاریخ جاننے کے لیے وید اور راماٸن سے مدد لینی ہوگی۔ غرضیکہ ہر قوم کی تاریخ انھیں افسانوی اور اساطیری تحیر خانوں میں جنم لیتی ہے پھر بعد میں اس کا رشتہ زندگی اور اس کے حقایق سے ہوتا ہے۔ اس لیے جب ہم عربوں کی قدیم تاریخ جاننا چاہیں گے تو سب سے پہلے ہماری نظر اسی اساطیری ادب پر پڑے گی۔

یہ افسانوی اور قصصی سرمایہ تاریخ کے بعض قدیم سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح اساطیر کے پردۂ سیمیں کے پیچھے حقایق کی دھندلی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً جگہوں کے نام، قلعوں کے نام اور ان کے جائے وقوع، بادشاہوں کے نام، القاب اور کبھی کبھی مدّتِ حکومت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض اوقات قبائل اور ان کی آبادیوں کا ذکر بھی انھیں افسانوں سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ قصصی مواد زیادہ تر جنوبی یمن سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جنوبی یمن میں کتنی مملکتیں قائم ہوئی تھیں۔ مثال کے طور پر مملکۂ قتبان کا ذکر عرب روایات میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف اتنا ذکر ہے کہ قتبان ایک قبیلے کا نام تھا جو عدن کے پاس رہتا تھا۔ البتہ قدیم یونانی اور رومن کتابوں میں اس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے موجود ہے۔ تھیوفرسیتس جس کا زمانہ ۳۱۲ سنہ قبل مسیح کا ہے وہ سبا، وحضرموت کے بعد قتبان کا ذکر کرتا ہے۔ جہاں یہ لوگ آباد تھے۔ اس کو وہ "کتبانیہ" لکھتا ہے اس کے علاوہ "ایراتھینوس" جو ۱۹۴ سنہ ق م سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی رائے کو اسٹریبو نے نقل کیا ہے، لکھتا ہے: "قتبان جنوبی عرب کے مغربی حصّے میں آباد تھے جو ارض سبا کے جنوب میں تھا۔ یہ حصّہ جنوب مغرب کی جانب باب المندب سے ملتا ہے۔" یاقوت الحموی نے قتبان کو نواحِ عدن میں آباد

Marfat.com

قرار دیا ہے۔ اسی طرح قتبان کے علاوہ دیگر ریاستیں قائم ہوئیں جن کا ذکر عرب تاریخ میں بہت کم ملتا ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی یمن کا یہ قصصی سرمایہ مملکۃ سباء اور مملکۃ حضرموت کے بارے میں بھی بالکل خاموش ہے۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات کا ماخذ یونانی کتب اور جدید اثری اکتشافات ہیں۔ اسٹریبو نے اپنے پیش رو مورخین کی کتابوں سے استفادہ کر کے ان کے بارے میں خاصی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں جسے اولیری نے اپنی کتاب میں ان موضوعات پر لکھتے وقت بطور ماخذ کے استعمال کیا ہے۔ مگر در اصل ان موضوعات پر تفصیلی مواد وہ کتبات اور نقود ہیں جنھیں ماہرین آثار قدیمہ نے بڑی کاوش سے تلاش کر کے جمع کیا ہے۔

سباء و معین کی زمانی ترتیب اور عہد کے بارے میں خاصے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن جس رائے کو غالب اکثریت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ سباء و معین دونوں ہمعصر ریاستیں تھیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں "معین" کے مقالہ نگار نے بڑی بصیرت انگیز معلومات فراہم کی ہیں[۳]۔ اس مضمون کے مصنف نے گلاسیر کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے ملر کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ "معین و سباء ہمعصر ریاستیں تھیں اور زیادہ سے زیادہ ان کا آغاز آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا اور دوسری صدی قبل مسیح تک وہ ختم ہوگئیں"۔

سباء و ریدان کے دور میں ایک اور قبیلہ بہت مشہور ہوا۔ اس کو قبیلۂ "حمیر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قدیم یونانی اور رومن کتابوں میں ان کو "ہومیریٹا" "اومیریٹا" کہا گیا ہے۔ بلینیوس نے حمیر کا ذکر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا پایۂ تخت "صفار" یعنی "ظفار" تھا۔ اسی کا خیال ہے کہ "اولیس غالس" کے

Marfat.com

حملے کے دوران یہاں قبیلۂ حمیر آباد تھا۔ یہ قبیلہ تعداد میں بہت زیادہ تھا۔ ہمدانی کی "کتاب الاکلیل"، "اخبار عبید بن شریۃ" اور عبدالملک بن ہشام کی "التیجان فی ملوک حمیر" میں اس موضوع پر تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ ان کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حمیر "ظفار" "رداع" اور "نجد حمیر" کے منطقوں میں آباد تھے۔ ان کی حکومت جنوبی عرب کے ساحلوں سے لے کر بحر احمر کے ساحل تک ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور مملکت کا ذکر آتا ہے جو یمن میں قائم ہوئی تھی۔ اس کو "مملکت حضرموت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ توراۃ میں "حضرموت" یقطان کے تیسرے بیٹے کا نام بتایا گیا ہے۔ لیکن عرب روایات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرموت کے نام سے کوئی مملکت بھی قائم ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس خیال کو مغرب کے علماء آثار قدیمہ نے اپنی تحقیقات کی بنا پر پیش کیا ہے۔

جنوبی عرب کے علاوہ، شمالی عرب، وسط عرب اور شمال مغرب کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں اور جس قدر ہیں بھی وہ عرب ماخذ کے بجائے یونانیوں اور ایرانیوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ حیرۃ اور آل غسان کی ریاستیں قدیم ہونے کے باوجود ہمارے پاس کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑ سکیں جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ وہ تاریخ نگاری کے فن سے آشنا تھے۔ اسی طرح شمال مغرب کا علاقہ جو نامعلوم زمانے سے بین البراعظمی شاہراہ رہا ہے اور اس راستے سے نہ صرف تجارتی قافلے ہندوستان سے مال لے کر بحر احمر کے ساحل سے گزرتے ہوئے خشکی کے راستے خلیج عقبہ پہنچتے تھے جہاں سے وہ سامان مصر ہوتا ہوا اسکندریہ کے راستے یورپ کی منڈیوں میں جاتا تھا بلکہ یہی گذرگاہ قافلۂ علم وفن کے لیے بھی راستے کا کام دیتی تھی۔ یونانی

Marfat.com

سیاح، علماء اور فلسفی اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اسی راستے سے متعدد تاریخی فوجی کارواں گزرے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے کتبات بھی نہیں ملتے جو شمالی عرب کی تاریخ پر روشنی ڈال سکیں، البتہ ہمسایہ ریاستوں کے بعض کتبوں سے منتشر اور غیر واضح معلومات ملتی ہیں۔ ایسی اطلاعات بہت کم ہیں جو عربی کتب میں مذکور ہوں۔ ان معلومات کا ذریعہ مشہور مورخ ابن الکلبی ہے۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ نجمیوں کی تاریخ معلوم کرنے کی غرض سے مخطوطات ڈھونڈ کر حاصل کرتا اور ان کی تحریروں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

سب سے قدیم عرب ریاست جو شمالی عرب میں قائم ہوئی وہ "انباط" کی تھی۔ اس ریاست کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ یونانی مورخین ہیں۔ دیودروس الصقلی اور جوزیفس نے اختصار سے ان معلومات کو اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے۔ اس ریاست کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پورے معنوں میں ترقی یافتہ ریاست تھی جو شام کی ریاست سے آنکھیں ملاتی اور کبھی کبھی ان سے ٹکر بھی لے لیتی تھی۔ یہ لوگ عربی بولتے تھے لیکن ان کی ادبی زبان آرامی تھی جو ہمسایہ عیسائی آبادی کی زبان تھی لیکن حسن اتفاق اور آسانی کے باوجود اس علاقے کے عربوں نے کوئی تحریری مواد اپنے پیچھے نہیں چھوڑا جو ہم تک پہنچ سکے۔

نبطیوں کے بعد ایک اور طاقت ور ریاست یعنی آل جفنہ کا ذکر ملتا ہے۔ یہ خاندان غالباً تیسری صدی عیسوی کے آخر میں یمن آیا اور شام کے بڑے علاقے پر قبضہ کر کے اس نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس خاندان کے بارے میں عربوں کے پاس روایات کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے۔ یہ روایات دور اسلامی میں منضبط کی گئی ہیں۔ اس خاندان کے حکمرانوں کی جو تعداد عرب

Marfat.com

مورخین پیش کرتے ہیں ان میں خاصا اختلال اور بعض اوقات تضاد نظر آتا ہے مثلاً حمزہ اصفہانی نے اپنی کتاب سنی ملوک الارض میں ۳۲، ابوالفداء نے ۳۱، مسعودی اور ابن قتیبہ نے ۱۱ کا ذکر کیا ہے۔ یہ اختلاف غالباً اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان مورخین کے مآخذ میں اختلاف پایا جاتا تھا چاہے یہ مآخذ زبانی ہوں یا تحریری شکل میں انھیں ملا ہو۔

نبطیوں کی طرح آل غسان کا بازنطینی سلطنت سے تعلق کافی دوستانہ اور پُر اعتماد تھا۔ انھوں نے مذہب عیسوی قبول کرنے کے ساتھ ان کی زبان آرامی بھی اختیار کر لی تھی جس کی بنا پر وہ شامی عیسائیوں کے رنگ میں رنگ گئے تھے اور اسی تہذیبی دائرے میں آ گئے تھے۔ اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ نکالنا ممکن ہو جاتا ہے کہ شاید ان میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی رہی ہو جنھوں نے آرامی ادب سے اچھی واقفیت حاصل کر لی ہو۔ اور اس طرح اس دور میں تاریخ نگاری کے فن سے خواہ اس کا جو بھی معیار شامی عیسائیوں میں موجود رہا ہو اس سے بخوبی واقف ہوتے ہوں۔ ایانس ملالس "IOANNES MALALAS" اور یعقوب "JACOB" کے نام بحیثیت تاریخ نگار کے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی اور اسی طرح کے دوسرے مصنفین کی کتابوں سے عربوں کی واقفیت کا امکان موجود ہے۔ لیکن اس مسئلے پر کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

شمالی عرب سے انسانی آبادی کی ہجرت کا ایک اور سلسلہ نظر آتا ہے۔ جس کی زمانی تعیین تو نہیں کی جا سکتی لیکن جو ہجرت کر کے دریائے دجلہ اور فرات کی وادی میں آباد ہوتے رہے اور بالآخر تیسری صدی عیسوی میں دریائے فرات کے مغرب میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہ قبائل اپنے کو تنوخ کہتے تھے۔

Marfat.com

عام خیال یہ ہے کہ ان کا دورِ حکومت ساسانیوں کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اس ریاست کے بارے میں ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں عرب روایات میں اس قبیلے کا پہلا سردار مالک بن فہم الازدی کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بیٹے جذیمۃ الابرش کو اردشیر نے گ رنر مقرر کیا تھا۔ اس طرح جذیمۃ الابرش اس خاندان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس خاندان نے چوتھی صدی عیسوی میں ایک آزاد ریاست قائم کی جس کا ساتویں صدی میں خاتمہ ہوگیا۔ تاریخ کی کتابوں میں ایرانی تاریخ کے پہلو بہ پہلو اس خاندان کے حالات کسی قدر تفصیل سے ملتے ہیں۔

اس موقع پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کردینا ضروری ہے کہ اہل ایران تاریخ نگاری کے فن سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ اس میدان میں وہ قدیم روایت کے مالک تھے۔ وہ تاریخ وار واقعات کو محفوظ کرتے تھے۔ حیرۃ یعنی لخمی ریاست کے عرب ایرانیوں سے کافی گہرے تعلقات رکھتے تھے اور تہذیبی طور پر اس کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ اس بنا پر یہ توقع قائم کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے ایرانیوں کی تاریخ نگاری سے نہ صرف یہ کہ واقفیت حاصل کی ہوگی بلکہ یہ بہت ممکن ہے کہ اس میں انھوں نے خود بھی حصہ لیا ہو۔ اس نکتے پر زور دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عرب مورخین نے جس میں ابن الکلبی کا نام خاص طور پر لیا جاسکتا ہے۔ قدیم ایران اور عرب حیرۃ کی تاریخ جاننے کی بڑی کوشش کی تھی۔ ابن الکلبی کے بارے میں یہ روایت عام طور پر ملتی ہے کہ وہ تاریخی واقعات حاصل کرنے کی غرض سے حیرۃ کے دیورو کنائس میں جاکر پرانے مخطوطات حاصل کرتا اور ان سے نوٹ لیتا تھا۔ اس طرح ان مخطوطات کا بڑا حصہ ابن الکلبی نے اپنے رسائل میں نقل کرکے

محفوظ کر لیا جو بعد کے عرب مورخین نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے نقل کر کے ہم تک پہنچایا ہے۔ اگر اہل حیرۃ کی مخطوطات کا کوئی اصل نمونہ ہمارے پاس ہوتا تو شاید عرب تاریخ نگاری کے کسی نہ کسی پہلو پر قابل قدر روشنی پڑتی۔

شمالی عرب میں کسی اور ریاست کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ وسطِ عرب میں چوتھی صدی عیسوی میں ایک ریاست کا ذکر ریاست کندہ کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ ریاست بہت مختصر مدت تک باقی رہی۔ اس خاندان کے حالات ہمیں عرب رواۃ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے زوال کے دور میں یہ لوگ اپنے اصلی وطن حضرموت چلے گئے۔ شمالی عرب کی مذکورہ ریاستوں کے علاوہ حجاز و نجد کی تاریخ "ایام عرب" کی شکل میں موجود ہے۔ اس علاقے میں کسی منظم ریاست کا پتہ نہیں چلتا۔ دراصل عرب قبائل خیموں میں زندگی بسر کرتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی ریاست یا حکومت قائم ہو۔ لیکن اس کے باوجود یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ ان قبائل کے بارے میں ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ کمیت کے اعتبار سے منظم ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ ان قبائل کے باہمی اختلافات جو اکثر تصادم کی شکل اختیار کر لیتے تھے ایام عرب کے لیے مواد بن گئے۔ اسی مواد پر وہ ایک شاندار نقشے کی عمارت تعمیر کرتے اور اسے یاد کرتے تھے۔ یہ نقشے جس قبیلے کی میراث ہوتے اس کی حفاظت کرنا اس قبیلے کی مجموعی ذمہ داری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ یہی سرمایہ نسلاً بعد نسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور عہد اسلامی میں ضبط تحریر کیا گیا۔

جزیرۃ العرب کی براہ راست تاریخ معلوم کرنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کا اندازہ اوپر کی مختصر بحث سے ہو سکتا ہے۔ اس ابتدائی تمہید کا

ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم یہ معلوم کریں کہ تاریخ نگاری کی روایت عربوں میں موجود تھی یا نہیں۔ اس بحث سے بڑی حد تک یہ بات سامنے آگئی کہ وہ ریاست و مملکت قائم کرنے کے باوجود اور قدیم دنیاؤں کے مابین نقطۂ اتصال کے ساتھ بھی اس فن سے کس قدر لاپرواہ تھے۔ اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل و وحشی بھی نہیں تھے کہ تاریخی شعور سے نابلد رہے ہوں۔ وہ اپنے فخر و مباہات، شان و شوکت، قوت و سلطنت، عروج و زوال کے حالات سے آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنے کی آرزو سے بہرہ ور رہے ہوں گے۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یمن کے باشندے پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے یہاں خط مسند جس کو خط حمیری کہتے تھے، رائج تھا۔ پھر انھوں نے اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کو کسی نہ کسی شکل میں کیوں نہیں قلمبند کیا۔ اس کا صحیح جواب دینا خاصا مشکل ہے۔ ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یمن کی متعدد ریاستیں جو تاریخ کے طویل دور سے گزری ہیں غالباً ان کے باشندے تاریخی شعور سے ناآشنا رہے ہیں جن میں اپنے حالات منضبط کرنے کی خواہش ہی نہیں پیدا ہوئی۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے پیچھے سرے سے کوئی ریکارڈ ہی نہیں چھوڑا۔ لیکن یہ بات دل میں اُترتی نہیں۔ اور نہ اس سے عقل ہی مطمئن ہوتی ہے۔ دوسری ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے تاریخ ضرور لکھی ہوگی مگر وہ باہمی جنگ و جدال کی نذر ہو گئی ہو۔ مثلاً ماہرینِ اثریات کا یہ خیال ہے کہ معین و سبا کے مابین شدید جنگیں ہوئی ہیں جن میں سبا نے معین کو تباہ کر کے ان کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ اہل معین کی تحریری یادگاروں کو اہل سبا نے تباہ کر دیا ہو۔ اس طرح سبا و حمیر کی باہمی

135001

چپقلش سبائی کتبات کی تباہی کا باعث بن گئی ہو۔ قبیلۂ حمیر کی تاریخ بھی تحریری طور پر نہ ملنے کی وجہ جنگ ہی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "ادیس غالیس" کے حملے میں اس کو نقصان پہنچا ہو۔ اس طرح اہلِ حبشہ کی مسلسل فوج کشی یمنیوں کی علمی ترقی میں مانع رہی ہو اور ان کے موجود سرمایہ کو نقصان پہنچا ہو۔ قوموں کی تاریخ میں اس طرح کے حالات پائے جاتے ہیں۔ اس بات کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جنوبی یمن کی ہمہ وقت سیاسی کشمکش اور جنگی صورت حال نے اول تو شاید اہل یمن کو اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیا اور اگر اس میدان میں انھوں نے کچھ کیا بھی تو وہ سیاسی خلفشار اور قتل و غارت گری کی نذر ہو گیا۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ خط مسند کا رواج تیسری و چوتھی صدی عیسوی میں کم ہو گیا تھا اور یہ زبان رو بہ زوال ہو چکی تھی۔ کیونکہ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اسلام کے ماضی قریب میں کوئی شخص خط حمیری سے آشنا رہا ہو۔ غالباً یہ زبان اس سے بہت پہلے مٹ چکی تھی۔ البراہتہ حاکم یمن کی کتاب جو چوتھی صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہے وہ بھی خط حمیری میں نہیں تھی۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ خط حمیری چوتھی صدی میں غیر معروف ہو چکا تھا۔ تاہم تبابعۂ یمن اور سباء کے بارے میں جو معلومات بھی عربی کتب میں موجود ہیں وہ عربوں کی اس ذہنی وراثت کا نتیجہ ہیں جنھیں ان کے حافظے نے محفوظ کر کے ان لوگوں تک منتقل کیا جنھوں نے اپنی کتابوں میں لکھ کر ہمیشہ کے لیے تباہی سے بچا لیا۔ ان میں عبید بن شریۃ الجرہمی، وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام اور کعب القرظی کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ یہ تھے وہ حالات کہ تاریخ نے ایک نیا قدم اٹھایا اور جزیرۃ العرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔

Marfat.com

حوالہ جات :

۱- محمد بن یزالمبرد۔ نسب عدنان و قحطان ص ۱۸۔ عبداللہ بن معصب بن الزبیر
کتاب نسب قریش ص ۴۔ ENCY OF ISLAM VOL. I. P. 533-564
مقالہ جزیرۃ العربیۃ۔

۲- ابن حزم۔ جمہرۃ انساب العرب، ص ۶-۷۔ ابن حزم قضاعۃ کے بارے میں
معلومات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۳- ENCY OF ISLAM VOL. 4. P. 5-18

۴- ہمدانی۔ کتاب الاکلیل ج ۱۰ مرتبہ محب الدین الخطیب، ج ۸،
مرتبہ نبیہ امین فارس۔

۵- ڈاکٹر جواد علی۔ تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۱، ۲، ۳۔

۶- O'LEARY, AROLIA BEFORE MUHAMMED.

Marfat.com

دوسرا باب

مغازی اور سیرۃ نگاری کا آغاز

جزیرۃ العرب میں اسلام کا ظہور ایک عہد آفریں واقعہ تھا۔ اس کے عظیم الشان اثرات دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل گئے۔ عربوں کی تہذیبی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں انقلاب پیدا ہوا۔ ان کے قبائلی رجحان کی آہنی دیواریں ٹوٹیں اور ان سے اتحاد عرب کی کرنیں طلوع ہوئیں۔ ان عربوں نے قبائلی تصور کے تنگ دائرے سے نکل کر انسانیت کا عالم گیر تصور دیکھا۔ انسانی مساوات، اخوت اور وحدت کی اقدار سے آشنا ہوئے۔ ان کی سیاسی کامیابیوں نے اس فکری و روحانی تجربے کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دی۔ اس سے ان کا جوش اور بڑھ گیا۔ انھوں نے جاں بازی، سرفروشی اور روحانی قوت سے کام لے کر مظلوم انسانیت کی نجات کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ایک طرف ایران کی ترقی یافتہ، تھکی ہوئی اور تعیش پسند فوج تھی جو عوام کی محافظ ہونے کے بجائے ان کے گلے کا پھندا بن گئی۔

Marfat.com

دوسری طرف وہ عرب تھے جو تازہ دم، پرجوش اور نڈر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں انھوں نے ساسانیوں کا تخت و تاج چھین لیا۔ ان عربوں کا رُخ دوسری طرف بھی تھا۔ انھوں نے بازنطینی سلطنت کو للکارا اور بہت جلد شام، مصر اور شمالی افریقہ کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ فوجی کامیابیاں دوسری قوموں سے اختلاط کا اہم ذریعہ بن گئیں۔ جب عربوں نے نجد و حجاز کی تپتی ہوئی اور جھلسا دینے والی گرم ہواؤں اور ناپیدا کنار ریگستانوں سے نکل کر ایران کے شاداب خطے میں قدم رکھا ہوگا۔ وہاں کے نغمہ ریز آبشار اور پھولوں سے لدے ہوئے باغات دیکھے ہوں گے، بلبل ہزار داستان کے چہچہوں سے محظوظ ہوئے ہوں گے تو ان کے دل و دماغ جذبات و احساسات کی کھردری اور سپاٹ دنیا میں بہار آگئی ہوگی اور انھیں یہ خیال آیا ہوگا کہ وہ تاریخ کے عظیم الشان دور کا آغاز کر رہے ہیں جس سے زندگی کا نیا سفر شروع ہوگا اور تہذیب و تمدن نیا رُخ اختیار کریں گے۔ اس کے عجیب و غریب نفسیاتی تجربے نے ان کے دماغ میں اپنے کارناموں کو قلمبند کرنے کا خیال پیدا کیا ہوگا۔

قدیم متمدن دنیا سے تعلق پیدا ہونے کی وجہ سے عربوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ان قدیم اقوام کی طرح اپنے ماضی کا پتہ چلائیں اور اپنے آباد و اجداد کی سرگرمیوں کو معلوم کریں۔ کیونکہ انھیں بھی اپنی قدامت کا پوری طرح احساس تھا اور اپنے شاندار کارناموں پر فخر۔ اس لیے قدیم آثار اور کارناموں کی تحقیق شروع ہوئی۔ اس طرف توجہ دینے والوں میں وہب بن منبہ، عبید بن شریہ اور ابن الکلبی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قدیم عرب بستیوں اور قبیلوں کے حالات جاننے کی فکر اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ قرآن پاک میں

ان کا ذکر یا ان کی طرف اشارہ موجود تھا۔ ان مقامات، قبائل اور تاریخی واقعات اور ان کی تفصیلات معلوم کرنے کا اہم کام شروع ہوا جو اپنے اندر کسی حد تک مذہبی، سیاسی، ادبی اور جنگی اہمیت رکھتے تھے۔ اس کام کو علم کی مختلف شاخوں سے دلچسپی رکھنے والوں نے اپنایا۔ اس کام میں مفسرین قرآن نے بھی حصہ لیا۔

علمی ضرورتوں نے مسلمان عربوں کو اسلام کے بالکل ابتدائی عہد کے مطالعے پر آمادہ کیا۔ فتوحات کی کثرت اور حکومت کے پھیلاؤ نے بہت سے انتظامی مسائل پیدا کر دیے۔ انھیں فوج کو ترتیب دینا تھا۔ انتظامی ادارے قائم کرنے تھے۔ لین دین کے اصول بنانے تھے۔ انفرادی و اجتماعی قوانین تشکیل کرنی تھی۔ معیشت و معاشرت اور سیاست کے میدان میں نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے، انھیں حل کرنا تھا۔ غرض عرب معاشرے کو نئی بنیادوں اور نئے وسائل پر منظم کرنا تھا۔ یہ تنظیم اس طرح ہونی تھی کہ اسلامی تعلیم سے انحراف نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ رسول اللہ صلعم کی زندگی اور اقوال و اعمال کی تحقیق و تدوین کی جائے۔ جو لوگ آپ کے ہمہ وقت رفیق تھے ان سے پوچھ تاچھ شروع ہوئی۔ صحابۂ کرام کے دور میں یہ کام اتنا وسیع پیمانے پر نہیں ہوا جتنا کہ تابعین کے دور میں ہوا۔ اس زمانے میں سیرت و حدیث کی تدوین کی طرف توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ صحابہ ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے تھے اور یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اس طرف سے غفلت ہوئی تو رسول اللہ صلعم کے حالات کا بڑا حصہ قلمبند ہونے سے رہ جائے گا۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں تدوینِ حدیث کا کام شروع ہوا جو دوسری صدی میں اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ احادیث کی جمع و تدوین کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ وہ واقعات بھی فطری طور پر جمع کیے جانے لگے جو فوجی اور سیاسی نوعیت رکھتے تھے۔ اس مواد کو علیحدہ سے مغازی کے نام سے مرتب کیا گیا۔

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فن سیرت و مغازی کی تدوین کا آغاز کس طرح ہوا۔ اس فن نے حدیث سے علیحدہ نشوونما پائی یا اسی کے ضمن میں اس فن کا آغاز ہوا۔ اس مسئلے پر مستشرقین کا یہ خیال ہے کہ فن حدیث ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا اور سیرت و مغازی نے علیحدہ جنم لیا اور مستقل فن کی حیثیت سے حدیث کے پہلو بہ پہلو ترقی کی۔ غالباً اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ابتدا میں سیرت و مغازی کے مولفین بھی حدیث کے عالم ہوتے تھے ان میں فرق نہیں ہوتا تھا اور انھیں بھی محدث کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ حدیث و مغازی کے مضامین سے یکساں دلچسپی رکھتے تھے۔ سیرت و مغازی کے مضامین جمع کرنے کا رجحان شروع ہی سے صحابہ اور تابعین کے ذہنوں میں موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر حدیث سے الگ مواد جمع کیا تھا۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سیرت و مغازی کے راوی اگرچہ حدیث پر اچھی نظر رکھتے تھے تاہم ان کے احادیث کی تعداد عام حدیث کی کتابوں میں بہت کم ملتی ہے اور وہ بحیثیت محدث کے زیادہ مشہور اور ممتاز نہیں ہوئے۔

قرآن کے مطالعے سے مسلمانوں کا ذہن ایک اور حقیقت کی طرف گیا وہ یہ کہ نبوتِ محمدی کوئی مجرد واقعہ نہیں ہے بلکہ نبوت و رسالت کے تاریخی سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ یہ خیال تاریخ نبوت و رسالت سے واقفیت حاصل کرنے کا اہم محرک بن گیا۔ مسلمانوں کو فکر ہوئی کہ وہ اس سلسلے کی تمام کڑیوں کو معلوم کریں اور یہ جانیں کہ پچھلے انبیاء کون کون تھے اور وہ کن کن قوموں کے

Marfat.com

پاس بھیجے گئے۔ ان اقوام نے پیام ربّانی کو قبول کرکے کیا پایا اور رد کرکے کیا کھویا۔ اس طرح ان قوموں کی تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوئی اور تاریخِ انبیاء کے سلسلے میں انھوں نے تاریخ اقوام سے واقفیت حاصل کی۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب مورخین کے تاریخی شعور میں وسعت اور گیرائی پیدا ہوئی اور انھوں نے عالمی تاریخ سے اپنا رشتہ جوڑا۔ انبیاء کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ایک گروہ موجود تھا جس سے عرب مورخین کو ضروری مواد فراہم ہوا۔ ان لوگوں میں وہب بن منبہ، کعب الاحبار، عبداللہ بن سلام اور کعب القرظی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا اس لیے انھیں قدیم قصص و اخبار سے واقفیت کا زیادہ موقع تھا۔ بعض کے بارے میں یہاں تک روایت ملتی ہے کہ وہ براہ راست توراۃ سے استفادہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے!

عرب علماء میں عبداللہ بن عباس کا نام بہت ممتاز ہے۔ وہ قرآنِ پاک کے مفسّر اور دیگر علوم کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے تاریخِ انبیا کے بارے میں معلومات کا وسیع ذخیرہ اپنی تفسیر میں جمع کر دیا تھا۔ ان معلومات کا ذریعہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار تھے۔ ابن عباس عرصہ تک انبیا کی تعلیمات، قوموں کے قصص ان لوگوں سے معلوم کرتے رہے۔ وہب کی معلومات اس موضوع پر کافی وسیع تھیں۔ چنانچہ یہ روایت ملتی ہے کہ اس نے "سیر الانبیاء" نام کی ایک کتاب مرتب کی تھی جس کو عبدالمنعم بن ادریس بن سنان نے جمع و روایت کیا تھا۔ اس کے مندرجات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ابن ندیم نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ تاریخ الانبیاء کا مواد تاریخ اسلام کا ایک حصّہ

Marfat.com

کب بنا۔ تحریری شکل میں محمد بن اسحق کی سیرت[۱] ابن ہشام کی کتاب کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ لیکن ابن ہشام نے اپنی کتاب میں سیر الانبیاء کے حصّے کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ البتہ مبعث و مغازی کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحق کے دور میں سیر الانبیا، مغازی کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ اس سے پہلے بھی کسی مولف نے اس حصّے کو مغازی کا تمہیدی حصہ قرار دیا تھا۔ اس کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ ابن اسحق نے اپنی کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا یعنی مبداء، مبعث اور مغازی۔ پہلے حصّے میں ابتدائے آفرینش سے بعثت محمدی تک کے حالات درج تھے اور مبعث کے حصّے میں آنحضرت کا شجرۂ نسب اور ہجرت تک کے حالات تیسرے حصّے میں ہجرت سے وفات نبوی تک کے حالات تھے۔ ابن اسحق نے کتاب المبداء کی تیاری میں وہب بن منبہ کی کتابوں اور دیگر عبرانی ماخذ سے استعمال کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہب اس کا ہمعصر تھا اگرچہ دونوں کی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ تاہم ابن اسحق نے وہب کی کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ خاص طور پر "قصص الانبیاء" اور "ذکر الملوک المتوجہ من حمیر و اخبارہم و قصصہم و قبورہم و اشعارہم"[۳] اس کے پیش نظر تھیں۔ عبدالمنعم نے غالباً "قصص الانبیاء" کا خلاصہ "کتاب المبداء" کے نام سے کیا تھا اور ابن ندیم کی مراد اسی کتاب سے ہے[۴]۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی علیحدہ مستقل کتاب رہی ہو۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں وہب کے مقالہ نگار نے دو اور کتابوں کو اس کی جانب منسوب کیا ہے۔ اس کو وہ "کتاب السیر" اور "کتاب المغازی" لکھتے ہیں[۵]۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہب نے مغازی پر ایک کتاب تالیف کی تھی جس کا ایک ٹکڑا پروفیسر بکر کو ملا تھا جسے انھوں نے ایڈٹ کر کے شائع

Marfat.com

کیا ہے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کیا "کتاب المبداء" واقعی "کتاب المغازی" کا ایک حصہ تھی۔ اگر اسے اس کا ایک حصہ مان لیا جائے تو یہ رائے قائم ہوسکتی ہے کہ تاریخ الانبیاء کو محمد بن اسحٰق سے پہلے وہب نے تاریخ اسلام کا ایک حصہ قرار دیا تھا۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو بھی اتنی بات تو صحیح ہے کہ "مبداء" یا "مبتداء" یا "مبتدا الخلق" جیسی اصطلاحات وہب کے یہاں ملتی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ابن اسحٰق نے اسے وہب سے لیا ہو۔ بہرحال ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر الانبیاء تاریخ اسلام کا تمہیدی حصہ وہب کے دور میں بن چکی تھی جسے ابن اسحٰق نے اپنی کتاب میں برتا تھا۔

عرب تاریخ نگاری کی محرک صدر اسلامی کی انتظامی ضروریات بھی تھیں۔ مثلاً وظائف کی تقسیم وظیفوں کی شرح مقرر کرنے کے لیے یہ تحقیق ضروری تھی کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ کس نے کب اسلام قبول کیا ہے۔ کیونکہ اسی کے مطابق وظیفے کی شرح مقرر کی جاتی تھی۔ جس شخص نے پہلے اسلام قبول کیا اس کو بعد میں قبول کرنے والے سے زیادہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس وظیفے کی تقسیم میں نسب و خاندان کی بھی اہمیت ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے قبول اسلام کے زمانے کی چھان بین ہوتی اور متعلقہ شخص کے کارناموں کی تحقیق کی جاتی۔ اس سے طبقات الصحابہ کا مواد اکٹھا ہوا جس کو بعد میں واقدی اور ابن سعد نے استعمال کیا۔ اسی انتظامی ضرورت میں یہ بھی ہوا کہ فوجوں کا رجسٹر تیار کیا گیا تاکہ مال غنیمت کی تقسیم اور تنخواہوں کی شرح کا ریکارڈ رہے۔ یہ کام حضرت عمرؓ کے دور میں شروع ہوا۔ ایک روایت ہے جب عراق کا لشکر فتوحات کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو صحابۂ کرام نے اس کا رجسٹر مدوّن کرنے کا مشورہ دیا۔[6]

Marfat.com

ممالک مفتوحہ میں زمینوں کی تقسیم، آراضی پر لگان وغیرہ کے مسائل نے حکومت کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ پہلے مفتوحہ ممالک کی نوعیت کا تعین کرے۔ یعنی کیا وہ ملک لڑائی سے فتح ہوا ہے یا صلح کے ذریعے ہاتھ آیا ہے یا اس ملک نے معاہدہ کر کے اطاعت قبول کر لی ہے۔ یہ اور اس طرح کے سوالات اُبھرے۔ اس لیے لوگوں نے فتوحات کے واقعات جاننے اور ضبط تحریر میں لانے کی طرف توجہ دی۔ چھوٹے چھوٹے رسائل میں ان کی پوری تفصیلات درج کی جانے لگیں۔ یہی رسائل آگے چل کر نہایت قیمتی تاریخی مواد کے طور پر کام آئے۔

عربوں کو ہمیشہ اپنے حسب ونسب پر بڑا ناز رہا۔ اس کی ان کے یہاں بڑی اہمیت تھی۔ اس کا اثر قبائل کی زندگی پر پڑتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ نسب کا عنصر انسان کی اخلاقی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس لیے آباء و اجداد کے کارناموں کو محفوظ رکھنا ہر قبیلے کا اجتماعی فریضہ تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے نسب پرستی کے تعصب کو بڑی حد تک کمزور کر دیا۔ پھر بھی اجتماعی تقاضوں کے تحت نسب کی اہمیت ایک حد تک باقی رہی اور رجسٹروں میں نام کے ساتھ قبیلے کا اندراج ہونے لگا۔ اس اہمیت نے علم الانساب کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ اور چھوٹے چھوٹے رسائل اس موضوع پر تصنیف کیے جانے لگے۔ اس کا آغاز پہلی صدی ہجری کے نصفِ اوّل ہی میں ہو گیا تھا۔ اس سے بھی تاریخ کی ترتیب میں کام لیا گیا۔

عرب معاشرہ پہلی صدی ہجری میں ایک تہذیبی کشمکش سے دوچار ہوا۔ یہ کشمکش قبائلی عصبیت پر مبنی تھی جس کو خارجی عوامل سے تقویت ملی۔ جو قومیں اسلام کے زیرِ نگیں ہوئیں انھوں نے عربی زبان سیکھنی شروع کی۔ نئے نئے

شہر آباد ہوئے جن میں موالیوں کی بڑی تعداد نے سکونت اختیار کرنا شروع کی۔ اس میل جول سے موالیوں نے عربی زبان میں دستگاہ پیدا کی مگر ان کا عربی میں غیر عربی الفاظ استعمال کرنا عربوں کو بہت بُرا لگا۔ ان میں اپنی زبان کی حفاظت کا شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اس عجمی اثر کو دُور کرنے اور زبان کی اصلیت کو باقی رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑی۔ زبان کے قواعد بنائے جانے لگے۔ شعراء ادبا نے اپنے دعووں کی سند کے لیے ایسے قبیلوں سے ربط پیدا کیا جو اپنی فصاحتِ زبان کے لیے مشہور تھے۔ ایسے قبیلے دور ریگستان اور صحراؤں میں آباد تھے۔ جب ان بدوؤں کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا تو صحرا کی خیمہ نشین زندگی کو خیرباد کہہ کر شہروں میں آکر آباد ہونے لگے۔ جہاں انھوں نے لغت اور صرف و نحو کے مولفوں کے لیے سند کے طور پر قصائد و اشعار فراہم کیے اور اس کا بھرپور معاوضہ پایا۔ ان قصائد کے ساتھ تاریخی نوعیت کی تمہیدی نثر بھی ہوتی تھی، یعنی قصیدے میں مذکورہ اشخاص، واقعات اور مقامات کی تشریح۔ اس کے علاوہ سیاسی، جغرافی دلچسپی کی معلومات بھی شامل ہوتی تھیں۔ جب رواۃ ان قصائد کی روایت کرتے تو نظم کے ساتھ نثر کا حصہ بھی نقل کرتے تھے۔ اس طرح یہ نثری سرمایہ بھی محفوظ رہتا تھا جو بعد میں تاریخ کی تدوین میں کام آیا۔

عربوں کی تاریخ نگاری کی نشوونما میں سیاسی تحریکوں کا بھی بڑا حصہ تھا۔ مثال کے طور پر شعوبیہ تحریک نے تاریخ نگاری کو دو حیثیتوں سے متاثر کیا۔ پہلی صورت یہ ہوئی کہ عرب مورخین نے اپنے ماضی کی طرف توجہ کی اور قدیم واقعات کو جمع کرنا شروع کیا۔ یہ معلومات سیاسی، جنگی اور ادبی ہر طرح کی تھیں۔ ان عجمیوں نے جو اسلام لائے تھے اپنے تاریخی و تہذیبی

Marfat.com

سرمائے کو قلمبند کرنا شروع کیا۔ ایرانیوں نے اپنی تاریخ کو عربی زبان میں ترجمہ کے ذریعے منتقل کیا تاکہ اس نئے سیاسی ماحول میں ان کی قدیم تہذیبی میراث محفوظ رہے اور علم و فن میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکیں۔ بعض اموی خلفاء نے اس کی ہمت افزائی کی اور کتابوں کے ترجمے کی سرپرستی کی۔ اس طرح پہلوی زبان سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہوا جس سے ساسانی عہد کے ملکی انتظامات کو سمجھنے اور بادشاہوں کی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان ترجموں نے تاریخی مواد کے دائرے کو وسیع تر کر دیا اور عربوں کے تاریخی تجربہ کو نئی سمتوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔

تاریخ نگاری کے محرکات اور اس کی نشو و نما کے عوامل پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ دراصل تاریخی کتابیں لکھنے کا رواج کب سے ہوا اور کن کن مرحلوں سے گزر کر اس نے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کی۔ متعدد قرائن و شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے نصف آخر میں تاریخی نوعیت کے رسالے اور مسودے مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے بلکہ چند لوگ بیاض کی شکل میں مذہبی نوعیت کی معلومات اور پہلے سے لکھتے تھے۔ بہرحال تاریخی نوعیت کی حامل ایک کتاب کا ذکر ابن ندیم کرتا ہے جس کو زیاد ابن ابیہ نے متوفی ۵۳ھ ہجری میں پہلی دفعہ مثالب پر تحریر کی تھی۔ یہ کتاب ناپید ہے۔ اس کی کوئی روایت یا ٹکڑا کسی تاریخی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے ابن ہشام الکلبی نے زیاد پر جو رسالہ تصنیف کیا تھا اس میں زیاد کی کتاب سے واقعات نقل کیے ہوں۔ ابن الکلبی کی کتاب کا نام "کتاب اخبار زیاد بن ابیہ" تھا۔ یہ کتاب بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ابن الکلبی کی کتاب میں زیاد کی کتاب سے روایتیں نقل کی گئی تھیں

Marfat.com

البتہ اس کا امکان ضرور موجود ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا نام دغفل بن حنظلہ البکری متوفی ۶۵ھ کا ہے۔ انساب پر اس کی نظر بہت وسیع تھی۔ اس کو آنحضرت کا زمانہ بھی ملا تھا مگر اس سے کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ ایک بار وہ امیر معاویہ کے پاس آیا تو انھوں نے فن نسب سے متعلق کئی سوالات پوچھے اور اس کے جواب سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے اپنے بیٹے کا استاد مقرر کر دیا۔ دغفل نے کوئی کتاب بھی تصنیف کی تھی اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ابن ندیم نے بھی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ امیر معاویہ کو حکایت سننے کا بہت شوق تھا۔ چونکہ دغفل کو اس بارے میں کافی معلومات حاصل تھیں اس لیے وہ اکثر حضرت معاویہ کو پرانے واقعات سنایا کرتا تھا۔ انھیں قصوں کو امیر نے اپنے کسی سکریٹری کے ذریعے مرتب کرایا تھا جس کا ذکر حسین نصار نے "التنافر و التناصر" کے نام سے کیا ہے[۶] اور اس کو دغفل کی تصنیف قرار دیا ہے۔

تیسرا نام مشہور عالم عبداللہ بن عباس کا ہے[۷]۔ وہ بچپن سے تحصیلِ علم کی طرف مائل تھے۔ حدیث، سیرۃ، مغازی، ایام و انساب اور تفسیر ان کے پسندیدہ مضامین تھے۔ حدیث سے گہرا شغف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں ان سے ۱۶۶۰ احادیث مروی ہیں۔ سیرۃ و مغازی پر ان کی معلومات بہت وسیع تھی[۸]۔ معلومات حاصل کرنے کا اہتمام اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہب بن منبہ اور کعب الاحبار کو برسوں اپنے ساتھ رکھا اور اس طرح سیر الانبیاء کی غالباً تمام روایات انھیں علماء سے حاصل کی ہیں۔ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ کے حالات پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی[۹]۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عباس نے دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں

Marfat.com

تصنیف کی ہوں گی جن کو بعد کے مصنفین نے استعمال کیا ہوگا۔[13] مگر اس کے نمونے ہمارے پاس نہیں ہیں اور نہ کوئی کتاب ہی موجود ہے البتہ ان کی "تفسیر القرآن" کا ذکر ملتا ہے جس کا بڑا حصّہ ابن جریر الطبری نے اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے۔

عبید بن شریۃ الجرہمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ یمن کا نامور قصہ گو عالم تھا۔ اس کے بارے میں مشہور رہا ہے کہ اس کو یمن کی قدیم تاریخ، بادشاہوں کے حالات اور پرانے قصص پر عبور حاصل تھا۔ اس کی یہ شہرت امیر معاویہ تک پہنچی تو انھوں نے اپنے پاس بلا لیا اور اس کو اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ امیر معاویہ کو وہ پرانے قصے اور یمن کی قدیم تاریخ کے واقعات سنایا کرتا تھا۔ وہ عبید سے اس موضوع پر سوالات کرتے جس کا وہ جواب دیتا تھا۔ یہی قصے جنھیں عبید سنایا کرتا تھا کتابی شکل میں محفوظ کر دیئے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان قصوں کی جمع و ترتیب میں عبید کا مشورہ شامل تھا یا نہیں۔ البتہ اس کو امیر معاویہ کے حکم سے مرتب کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر ابن ندیم نے "کتاب الملوک واخبار الماضیین" کے نام سے کیا ہے[14] جو اخبار عبید بن شریۃ فی اخبار الیمن واشعارہا وانسابہا" کے عنوان سے چھپ چکی ہے۔ عبید کی ایک اور کتاب کا ذکر ابن ندیم نے "کتاب الامثال" کے نام سے کیا ہے[15]!

عبید کی کتاب کے قصص و افسانے تاریخ کا درجہ نہیں رکھتے۔ البتہ ان سے تاریخی افسانوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے واقعات میں مبالغہ اور تدلیس کا رنگ پایا جاتا ہے۔ بہت سے اشعار جو نقل کیے گئے ہیں ایسے ہیں جنھیں شعر کہنا بھی درست نہیں ہے مثلاً طسم بن لاود کی طرف منسوب اشعار[16]۔ دوسرے قسم کے اشعار نسبتاً بہتر ہیں مگر یہ بھی ان اشخاص کے نہیں ہیں جن کی جانب

Marfat.com

منسوب کیے گئے ہیں بلکہ انھیں دوسرے لوگوں نے گھڑ کر ان کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ تیسرے درجے کے وہ اشعار ہیں جو عرب کے معروف شعراء کے ہیں مثلاً امرؤ القیس، امیہ بن خلف، حسان بن ثابت، نابغہ[۲۰] الذبیانی اور لبید بن ربیعۃ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبید نے اپنی کتاب کو نہ تو خود مدون کیا تھا اور نہ ہی اس کا عنوان اس نے مقرر کیا تھا۔ اس کے بجائے ایسے اشارے ملتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ اصل نسخہ نہیں ہے بلکہ کسی پرانے نسخے کی نقل ہے۔ اس کا یہ جملہ " اخبار عبید بن شریۃ الجرہمی فی اخبار الیمن و اشعارہا و انسابہا علی الوفاء والاکمال والحمد للہ" یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو کسی کاتب نے نقل کیا ہے۔ پوری کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ نسخہ نہ صرف منقول ہے بلکہ اس کو بہت بعد میں مرتب کیا گیا ہے اور مرتب نے اس کے اندر ردوبدل اور اضافے کیے ہیں۔ مثلاً ثمود بن عادیۃ کے قصے کو کئی ماخذ سے لے کر مکمل صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں محمد بن اسحق اور وہب بن منبہ کی روایات کو نقل کیا گیا ہے[۲۲] جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس کتاب کو دیگر کتب کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ نیز اس کے مرتب کو محمد بن اسحق اور وہب بن منبہ کی روایات کا علم تھا۔ ہو سکتا ہے اس کتاب کا مرتب ہشام رہا ہو جس نے دیگر کتب کی مدد سے اضافے کیے۔ اس رائے کا اظہار F. KRENKOU نے اپنے ایک عالمانہ مضمون میں کیا ہے۔[۲۳]

عبید بن شریۃ کے نام سے کوئی شخص بھی گزرا ہے اس کے بارے میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے ہشام سے پہلے کسی قصہ گو نے جس کا تعلق یمن سے ہو اس کتاب

Marfat.com

کو مرتب کر کے عبید بن شریہ نامی فرضی شخص کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ کرنکوف نے بھی عبید کی شخصیت سے انکار کیا ہے۔ تراجم کی کتابوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ جس سے اس رائے کی تقویت ہوتی ہے۔ اخبار عبید کی تاریخی حیثیت سے قطعِ نظر یہ کتاب اپنی اہمیت کے اعتبار سے توجہ کی مستحق ہے۔ کیونکہ اس کتاب کے ذریعے قبل اسلام کے قریبی عہد کے تہذیبی حالات پر روشنی پڑتی اور جاہلی دور کے عربوں کی عقلی و فکری خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ان قصص و حکایات کے علاوہ اسی دور میں سیرت و مغازی کی کتب مدون کی جانے لگیں۔ مغازی غزوہ کی جمع ہے یعنی وہ جنگیں جن میں آنحضرت بذاتہ شریک تھے۔ لیکن مغازی کا استعمال اصطلاحی طور پر اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے دائرے میں آنحضرت کی سیرت اور عہد رسالت کے پورے واقعات کو شامل کیا گیا ہے۔[۲۴] البتہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ سب سے پہلے کس کتاب کو سیرتِ رسول کا نام دیا گیا۔ سیرت کی قدیم کتابوں میں سیرۃ ابن اسحٰق کی تلخیص سیرۃ ابن ہشام کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ لفظ سیرت دوسرے اشخاص کی سوانح کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے مثلاً "کتاب سیرۃ معاویہ" "کتاب سیر الملوک" عام معنوں میں مستعمل ہے لیکن اکثر "السیرۃ" کا لفظ مغازی کے ساتھ استعمال ہوا ہے جیسے "السیرۃ والمغازی" یا "السیر والمغازی" وغیرہ۔

سیرت و مغازی کی ابتدا

سیرت و مغازی کے موضوع پر کتابیں تالیف کرنے والوں میں پہلا نام ابان بن عثمان کا لیا جاتا ہے۔[۲۵] یہ حضرت عثمان غنی کے صاحبزادے تھے۔ حدیث و فقہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ خلیفۂ ثالث کے فرزند ہونے کی بنا پر ان کو رسول اللہ

کے بارے میں بہت اہم اور براہ راست معلومات حاصل تھیں۔ مگر بدقسمتی سے ان کی معلومات ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ ایک اطلاع ہے کہ انھوں نے مغازی کی سب سے پہلی کتاب مرتب کی تھی۔ اس کو مغیرۃ بن عبدالرحمٰن نے روایت کیا تھا[۲۶] ابن سعد کا بیان ہے کہ مغیرۃ نے ابان سے مغازی کی سماعت کی تھی۔ یعقوبی کا اشارہ اسی کتاب کی طرف ہے[۲۷] مگر سیرت کی موجودہ کتب میں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی جس سے ان کی مغازی کا کوئی ٹکڑا براہ راست ہمارے سامنے آسکے۔ مشہور محدث ہونے کی وجہ سے ابان کا نام احادیث کی سندوں میں کثرت سے آتا ہے۔ ان کے بیٹے ابوالزناد اور الزہری نے ان سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ ابان کے ہمعصر عالم عروۃ بن الزبیر ہیں جو اپنے دور کے بلند پایہ محدث اور مشہور فقیہہ گزرے ہیں۔

عروۃ بن الزبیر مدینہ کے چار مشہور فقہا میں سے ایک ہیں[۲۸]۔ ابوالزناد کا قول ہے مدینہ میں چار فقیہہ ہیں۔ سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، قبیصۃ بن الذویب اور عبدالملک بن مروان۔ عروۃ کا گھرانہ بہت با اثر تھا اور اس کو بڑی سیاسی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے باپ نے عہدِ نبوی میں بڑے شاندار کارنامے انجام دیے تھے جن کی وجہ سے انھیں عشرۂ مبشرہ میں شامل ہونے کا فخر حاصل تھا۔ اس بنا پر ان کو آنحضرت کی قربت حاصل تھی اور سیرت طیبہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ ان کا بڑا وقت رسول اللہ کی رفاقت میں گزرا تھا اس لیے آپؐ کی زندگی کے مختلف گوشے ان کی نظروں کے سامنے تھے۔ عروہ نے جنگ جمل ۳۶ھ میں شرکت نہیں کی تھی جس میں ان کے باپ کام آئے۔ غالباً اس وقت وہ چھوٹے تھے اور ان کی عمر کوئی دس سال کی رہی ہوگی۔

Marfat.com

عروۃ کو حدیث و مغازی سے غیر معمولی شغف تھا۔ یوں بھی وہ علم سے مطلقاً بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی اس محبت کا یہ عالم تھا کہ جب "یوم حرّۃ" میں انھوں نے مجبور ہو کر فقہ کی ساری کتابیں جلا ڈالیں تو ساری عمر اس کا سخت افسوس کرتے رہے۔ اکثر حسرت و یاس میں کہا کرتے تھے "کاش میں نے انھیں برباد نہ کیا ہوتا۔ کیونکہ وہ تو مجھے اپنے خاندان اور مال متاع سے بھی زیادہ عزیز تھیں"[۲۹]۔ ایک اور موقع پر انھوں نے کہا "میری تمنّا دنیا میں زہد اور آخرت میں نجات ہے۔ میں چاہتا ہوں علم کی روایت مجھ سے کی جائے"۔ اس کا عملی ثبوت یہ دیا کہ تحصیل علم کی راہ میں انھوں نے سب چیزوں کو چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی روایات کے برخلاف کبھی سیاست میں نہیں پڑے۔ اس لیے کہ علمی کاموں کے لیے جس سکون قلب کی ضرورت ہے وہ سیاست کے ہنگاموں میں باقی نہیں رہتا۔ اموی خلفا کے ساتھ ان کا رویہ مصالحانہ رہا۔ غالباً دربار اموی میں ان کے چند بہی خواہ بھی موجود تھے جو اُن کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ خواہ سیاسی مصلحت کی بنا پر ہی کیوں نہ ہو بہر حال دونوں طرف سے رواداری کا مظاہرہ ہوتا رہا[۳۰]۔ عبدالملک عام طور پر ان سے مہربانی کا برتاؤ کرتا تھا۔ البتہ اغانی کی ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ آخر میں عبدالملک سے ناراض ہو گئے تھے کیونکہ وہ ان سے سرد مہری سے پیش آنے لگا تھا۔ جب عروۃ کے بھائی کو شہید کر دیا گیا تو انھوں نے دمشق کا سفر کیا اور عبدالملک سے ملاقات کی۔ خلیفہ کے برتاؤ میں وہ گرم جوشی نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ جب عروۃ نے اس کا سبب دریافت کیا تو عبدالملک نے جواب میں ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا۔ "کچھ لوگ ایسے ہیں جو بلا کر عزت سے پیش نہیں آتے اس لیے اپنے وطن ہی

Marfat.com

میں مقیم رہو" اس کے بعد عروۃ مدینے چلے گئے۔[۳۱] چونکہ عروۃ کو حدیث اور فقہ پر عبور حاصل تھا اس لیے عمر بن عبدالعزیز جو مدینے کے گورنر تھے وہ اکثر بلا کر ان سے مشورہ لیتے تھے۔ عروۃ بہت عالی ظرف بھی تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے بنی امیۃ سے اپنے تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا۔ بھائی کے قتل کی ذمہ داری بالواسطہ طور پر عبدالملک کے سر پر تھی تاہم وہ برابر اس سے مدارات کا معاملہ رکھتے رہے۔ اس کے علاوہ ان کی اس گفتگو سے بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے اور علی بن حسین کے مابین ہوئی تھی۔ یہ علی بن الحسین حضرت علی کے ایک پوتے تھے۔ اس گفتگو میں عبداللہ بن حسن بھی شریک تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ" ایک رات ہم باتیں کر رہے تھے یہ عبدالملک یا ولید کا زمانہ تھا۔ بات کا رخ بنی امیہ کے جور و ستم کی طرف پھر گیا جو انھوں نے اپنے عہد اقتدار میں کیے اور لوگ بے بس دیکھتے رہے۔ پھر انھوں نے اس عذاب سے خوف ظاہر کیا ہے کہ جو بنی امیہ پر کیا جائے گا۔ یہ سن کر عروۃ نے علی سے کہا" اے علی جو شخص ظلم سے خود کو علیحدہ رکھتا ہے اور جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ ظالموں کے فعل سے نفرت کرتا ہے تو خواہ وہ ان کی طرف تھوڑا سا میلان بھی رکھتا ہو جب ظالموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا تو خدا سے امید کی جاتی ہے کہ وہ شخص محفوظ رہے گا" پھر عروۃ نے مدینہ چھوڑ کر العقیق کی راہ لی اور عبداللہ وہاں سے نکل کر سویق میں مقیم ہو گئے۔[۳۲]

عروۃ نے مغازی کے موضوع پر بہت سارا مواد اکٹھا کر کے اپنی کتاب میں جمع کر دیا تھا۔[۳۳] مغازی کی یہ کتاب نایاب ہے مگر اس کے ٹکڑے سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ محمد بن اسحٰق،[۳۴] واقدی، طبری[۳۵] اور ابن سید الناس[۳۶] نے

Marfat.com

اپنی اپنی کتابوں میں عروۃ کی مغازی سے مواد نقل کیا ہے۔ عروۃ کی روایات درحقیقت مغازی کے وہ قدیم ترین نمونے ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں غزوات کے علاوہ آپؐ کے زمانے کے واقعات بھی درج کیے مثلاً آغاز وحی کی کیفیت اور ہجرت حبشہ وغیرہ۔

عروۃ نے مغازی کا مواد غالباً ان سوال ناموں کے جواب میں مرتب کیا تھا جو عبدالملک وقتاً فوقتاً ان کے پاس بھیجتا رہتا تھا۔ ایک اور شخص ابن ابی ہنیدہ ان کے رسائل کا مخاطب ہے جو خلیفہ ولید کے دربار سے وابستہ تھا۔ یہ اپنے جواب کو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں لکھ کر بھیجتے تھے جن کو بعد میں انھوں نے کتابی شکل میں یکجا کر دیا ہوگا جسے ان کے بیٹے ہشام بن عروۃ نے عام طور پر روایت کیا ہے۔ عبدالملک کے سوالات اور عروۃ کے جوابات کا زیادہ تر تعلق غزوات سے ہے۔[۳۷] ان جوابات کو غور سے پڑھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ عروہ نے واقعات کو بیان کرنے میں سند کی سختی سے پابندی نہیں کی ہے[۳۸] بلکہ واقعات کو سلسلے سے بیان کر دیا ہے۔ مگر اس کے برخلاف جن واقعات کا تعلق غزوات سے نہیں ہے مثلاً آغاز وحی اور ہجرت حبشہ، ان کے اندر سند کا اہتمام کیا گیا ہے۔[۳۹] اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے غزوات کی بیشتر روایات براہ راست اپنے گھر والوں سے حاصل کیں جو ان کے راوی ہیں۔ ایک اور امکان یہ ہے کہ اس وقت تک اسناد سے پابندی کے ساتھ کام نہیں لیا جاتا تھا بالخصوص مولفین مغازی اس کی پابندی سختی سے نہیں کرتے تھے۔

عروۃ کی روایات پڑھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یہ مواد نہایت ہی مستند ذرائع سے اکٹھا کیا تھا مثلاً مدینے کے علمائے کبار میں

Marfat.com

حضرت عائشہ اور حضرت علی جیسے لوگ ان کے آخذ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اپنے والد بزرگوار سے جو آنحضرت کے دست راست تھے بہت سی معلومات حاصل کی تھیں۔ خود ان کی ماں بھی ایک قابل اعتماد ذریعہ تھیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عروۃ نے جن معلومات کو اکٹھا کیا تھا وہ ثقاہت، استناد کی اعلیٰ خصوصیات سے متصف ہیں۔ عروۃ کی محنت اور احتیاط کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوشش کر کے بعض اصل مسودات حاصل کیے اور انھیں بلا کم و کاست نقل کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ تحریریں جو آنحضرت نے اہل حجر، ذراعۃ بن ذی یزن اور عبداللہ بن جحش کو ارسال کیں[۴۰]۔ سیرۃ کے علاوہ عروۃ خلفاء کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے اور انھوں نے اس موضوع پر خاصا مواد جمع کیا تھا۔ طبری نے ان معلومات کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ مثلاً جنگ یرموک اور قادسیہ سے متعلق اطلاعات کے لیے طبری نے عروۃ پر اعتماد کیا ہے[۴۱]۔ اس کے علاوہ جیش اسامہ کو بھیجنے کا واقعہ[۴۲]، قبائل کا ارتداد[۴۳]، حضرت ابوبکر کے پاس متمم بن نویرۃ کی آمد[۴۴]، خلیفہ کا شام کو فوج بھیجنا اور قائدین کا تقرر، اجنادین کا واقعہ، خیبر و فدک کی وراثت کا سوال، حضرت ابوبکر کا ترک تجارت اور بیت المال سے تنخواہ لینا، علالت اور وفات[۴۵]، خلیفہ کا ایلہ جانا اور جنگ جمل کے واقعات عروۃ کی سند سے بیان کیے گئے ہیں۔ ان شہادتوں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عروۃ نے خلفاء راشدین کی تاریخ سے بھی گہری دلچسپی لی تھی اور اس موضوع پر بہت سارا مواد جمع کیا تھا۔ مگر ہم یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے کوئی مستقل کتاب بھی اس موضوع پر لکھی تھی۔ تاریخ الخلفاء کا یہ مواد ان کی مغازی کا ایک حصہ رہا ہو جس کو دوسرے مواد

کی طرح خلفائے بنی امیہ کے سوالناموں کے جواب میں مرتب کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عروۃ نے ان معلومات کو علیحدہ کسی کتاب میں قلم بند کیا ہو جسے بعد کے مورخین نے استعمال کیا۔

عروۃ نے اپنی مغازی کے اندر واقعات کی ترتیب میں تاریخی تسلسل کو ملحوظ رکھا تھا یعنی وہ وحی سے آغاز کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دعوتِ اسلام، ہجرت حبشہ و مدینے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر سریوں کا یعنی سریہ عبداللہ بن جحش کا بیان آتا ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بدر، غزوۂ قینقاع، غزوۂ خندق، غزوۂ بنی قریظہ، صلح حدیبیہ، موتہ و فتح مکہ اور غزوۂ حنین و طائف کا ذکر آتا ہے۔ آخر میں آنحضرت کے بعض مراسلات، پھر آپ کی زندگی کے آخری حالات تا وفات بیان کیے گئے ہیں۔ اس ترتیب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عروۃ نے اپنی کتاب میں تاریخی تسلسل کو باقی رکھنے میں اہتمام سے کام لیا ہے۔ اس کتاب میں وہ مواد تو شامل ہی ہے جو انھوں نے رسالوں کی شکل میں عبدالملک کو بھیجا تھا بلکہ وہ مواد بھی شامل ہے جو اپنے شاگردوں کو املا کراتے تھے۔

عروۃ کی تحریروں کو پڑھتے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ بیان سادہ اور بے تکلف تھا جس میں مبالغے کا نام بھی نہیں تھا۔ ایک بہت اہم خوبی جو ان کی مغازی میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ ہر واقعے سے پہلے اس کا پس منظر بیان کرتے ہیں جس سے واقعے کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کو لے لیجیے۔ عروۃ اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں اور قریش کی باہمی کشاکش کا ذکر مختصر مگر جامع طور پر کرتے ہیں۔ اس طرح ہجرت حبشہ کا واقعہ بیان کرتے وقت پہلے قریش اور مسلمانوں

Marfat.com

کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرزِ تحریر سے عروۃ کے منطقی انداز فکر اور تجزیاتی ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عروۃ نے اس تالیف کے ذریعے مغازی پر کام کرنے والوں کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں اور یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ انھوں نے واقعات کا جو خاکہ اس کتاب کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اس میں رنگ بھرنے کا سہرا ان کے جلیل القدر شاگرد محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب الزہری کے سر ہے۔

محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب الزہری اس زمانے میں پیدا ہوئے جب خلافت بنی امیہ نے اپنے استحکام کی آخری حدیں چھو لی تھیں اور اسی کے ساتھ زوال کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان کے خلاف سیاسی سرگرمیاں اور سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ عربی اور عجمی تعصبات کو بڑی مقدار میں غذا مل رہی تھی۔ اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عرب فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں شام و مصر اور افریقہ کی دولت سمٹ سمٹ کر مدینے اور دمشق میں آ رہی تھی۔ اس سیاسی برتری اور تمدن کے ماحول میں انھوں نے ایک نئے تمدن کو پروان چڑھایا جس کی بنیادی خصوصیات علم و ادب کا ذوق اور علماء کی قدر و منزلت تھی۔ اس زمانے میں علوم و فنون کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔ مدینہ اس وقت بھی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز تھا اس لیے گو خلفاء بنی امیہ اپنا دار الخلافہ دمشق بنا چکے تھے تاہم مدینے کی اہمیت سے غافل نہیں تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انھیں اپنی سیاسی قوت کی بقا و استحکام کے لیے مدینے کے با اثر لوگوں بالخصوص بچے کھچے صحابہ اور تابعین کی حمایت درکار ہے۔ ان لوگوں میں وہ بھی تھے جو

Marfat.com

علمی سرگرمیوں میں منہمک تھے یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور تاریخ جیسے مضامین کی جمع و تدوین میں لگے ہوئے تھے۔ زہری کا شمار انھیں علمائے کبار میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں قابلیت اور علم کا انحصار بڑی حد تک انسان کے اپنے حافظے پر تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور آسان ذریعہ علم و فن کو محفوظ رکھنے کا عام نہیں ہوا تھا۔

زہری کا حافظہ کافی تیز اور قوی تھا۔ ایک روایت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۸۰ دن میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔[۴۴] ایک موقع پر زہری نے کہا: "میں نے کسی بات کو یاد کر لینے کے بعد بھلایا نہیں۔[۴۴]" اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر بے محل نہ ہوگا اس سے ان کی قوتِ حافظہ کا بھی اندازہ ہوگا۔ ایک بار ہشام نے زہری سے کہا: "میرے لڑکے کے لیے احادیث املا کرا دیجیے۔" چنانچہ ایک کاتب کو بلایا اور زہری نے اسے چار سو احادیث املا کرائیں۔ اس کے بعد وہ چلے گئے دوبارہ جب ہشام کے پاس آئے تو اس نے کہا کہ وہ کتاب جسے آپ نے املا کرایا تھا گم ہوگئی۔ اس پر زہری نے دوبارہ کاتب بلوایا اور اسے چار سو احادیث املا کرا دیں۔ ہشام نے زہری کے جانے کے بعد جب پہلے نسخے سے مقابلہ کیا تو دوسرے میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں ملا۔[۴۹] زہری اپنے حافظے کی تیزی کو برقرار رکھنے کی عملی تدبیریں بھی اختیار کرتے تھے۔[۵۰]

زہری کو تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب بھی وہ کسی مجلس میں جاتے تو سامنے کے بجائے پیچھے سے داخل ہوتے اور اس کے بعد اس مجلس کے ہر جوان و بوڑھے سے اپنے کام کی بات پوچھتے تھے۔ گھر واپس ہوتے ہوئے انصار کے گھروں سے ہو کر گزرتے ان کے گھروں میں بوڑھے، جوان، مردوں اور عورتوں سے سوالات کرتے تھے۔[۵۱]

Marfat.com

اور جو کچھ سنتے تھے اسے لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ صالح بن کیسان جو زہری کے ہم عصر تھے کہتے ہیں کہ ہم دونوں نے احادیث لکھنے کا ارادہ کیا اور بہت سی حدیثیں لکھیں۔ پھر اس کے بعد انھوں نے صحابہ کے حالات واقوال بھی لکھے۔ میں نے کہا یہ سنت نہیں ہے تم کیوں لکھتے ہو مگر وہ نہیں مانے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مجھ سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی[۵۲]۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زہری نے کئی کتابیں مرتب کی تھیں۔ ان میں سے ایک احادیث کے لیے تھی جو ظاہر ہے اپنے زمانے کا ایک مستند مجموعہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی[۵۳]۔ احادیثِ نبوی کو جمع کرنے کی بڑی وجہ زہری کی وہ عقیدت تھی جو انھیں آنحضرتؐ کی ذات سے تھی جس کو وہ ذریعۂ نجات بھی سمجھتے تھے۔ مزید برآں وہ علمی مشاغل کو عبادت کی اعلیٰ ترین شکل کہتے تھے[۵۴]۔ وہ معلومات کو جمع کرنے میں صحت کا بڑا اہتمام کرتے[۵۵]۔ ان کی دلچسپی کے دائرے میں احادیث، صحابہ کے کارنامے اور تاریخ الخلفاء جیسے مضامین کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر انھوں نے معلومات کا انبار جمع کر لیا تھا اور وہ اپنے پیچھے درجنوں مسودات چھوڑ گئے جن کو جانوروں پر لاد کر لے جایا گیا[۵۶]۔ اسی لیے وہ اپنے دور کے ممتاز ترین عالم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ معمر کا خیال ہے کہ زہری اپنے فن میں یکتا تھے[۵۷]۔ ایوب کا خیال ہے کہ میں نے زہری کا ثانی نہیں پایا[۵۸]۔ مکحول سے کسی نے پوچھا کہ تیری نگاہ میں کون بڑا عالم ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ابن شہاب[۵۹]۔ ان معاصرین کے بیانات سے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ زہری اپنے فن کے امام تھے اور انھوں نے معلومات کے حصول میں بڑی مشقت اور صبر سے کام لیا تھا[۶۰]۔

Marfat.com

ابن شہاب بڑے با اخلاق اور فیاض بھی تھے۔ ان کے اس صفت اخلاق کی تعریف قائد اقرم نے اپنے اشعار میں کی ہے۔[٦١] غالباً اسی وجہ سے وہ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ وہ جو کچھ جانتے تھے اسے دوسروں تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ علم کی اشاعت سے غفلت نہیں برتتے تھے چنانچہ اس کی تائید ان کے اس بیان سے ہوتی ہے ”میری طرح کسی اور نے علم کو نہیں پھیلایا“[٦٢] زہری صاحب قلم تو تھے ہی مگر بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ میدانِ کارزار میں بھی اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ محمد بن اشکاب کا کہنا ہے ”ابن شہاب میدان وغا کے بھی مرد تھے“[٦٣] جری اور دلیر ہونے کے باوجود علم سے گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے ان کے اندر حد درجہ انکساری بھی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اظہارِ حق میں خلیفہ تک کی رعایت نہیں کرتے تھے بلکہ بے دھڑک اس کا اظہار کرتے تھے۔ ایک بار ہشام نے ”الذی تولیٰ کبرہٗ فہم“ کا مشار الیہ دریافت کیا تو زہری نے جواب دیا کہ اس سے مراد عبداللہ بن ابیّ ہے۔ ہشام نے کہا جھوٹ کہتے ہو اس سے مراد علی ہیں۔ زہری نے یہ سن کر کہا۔ میں جھوٹ بولتا ہوں؟ تمہارے ماں باپ ہلاک ہوں اگر آسمان سے کوئی منادی یہ آواز دے کہ جھوٹ بولنا جائز کر دیا گیا ہے تو بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔[٦٤] یہ واقعہ زہری کی حق گوئی اور بے خوفی کی عمدہ مثال ہے۔

جب یہ روایت ملتی ہے کہ زہری نے پہلی بار علم کو مدون کیا اور سب سے پہلے فن مغازی کو مرتب[٦٥] کیا تو اس کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے متفرق روایات کو پہلی بار علحدہ علحدہ موضوعات کے تحت جمع کیا تھا۔ زہری کی دلچسپی اور محنت کے نتیجے میں مختلف موضوعات پر خاصا مواد جمع ہوگیا تھا۔ ان کی اس لگن سے متاثر ہو کر عمر بن عبدالعزیز اور ہشام نے ان کو جمع احادیث

کے کام پر مامور کیا۔ اس کام کو زہری نے بحسن وخوبی انجام دیا جس کی بدولت ایک کتاب مدون ہوئی اور ہشام کی لائبریری میں محفوظ کر دی گئی۔ زہری اس کتاب پر لکچر بھی دیتے تھے۔ یہ لکچر پابندی سے ہوتے اور انھیں لوگ سیکڑوں کی تعداد میں سنتے تھے اور کبھی کبھی خلیفہ بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ زہری کی تحریروں کا پورا سرمایہ ہشام کی لائبریری کے حوالے کر دیا گیا تھا مگر افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ زہری کا یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو گیا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ان کتابوں میں نقل ہو کر محفوظ رہ گیا جو اُن کے شاگردوں نے تالیف کی تھیں۔

ابن ہشام نے ابن اسحق کے ذریعے زہری کی بہت سی روایات ہم تک پہنچا دی ہیں۔ مثال کے طور پر مصریوں کے بارے میں رسول اللہؐ کی نصیحت[66]، بازان جو فارس کا آخری گورنر تھا اس کا قبول اسلام[67]، کسریٰ کا خط[68]، ستاروں کے ٹوٹنے کا واقعہ[69]، ابوسفیان اور ابوجہل کا چھپ کر قرآن سننا[70]، مسلمانوں کا ہجرت حبشہ اور وفد قریش کی آمد[71]، اور حبشہ پر نجاشی کے برسر اقتدار آنے کا واقعہ[72] زہری کی سند سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ابوبکرؓ کے الدغنہ کا جوار قبول کرنے کا واقعہ[73]، معراج کا ایک ٹکڑا[74]، عقبۂ اولیٰ کا ایک حصہ[75]، ہجرت رسولؐ کا مفصل بیان[76]، مدینے کے ایک یہودی کے معاملے میں نیچے ہونا[77]، عبداللہ بن ابی کو دعوت اسلام دینا[78]، غزوۂ احد کے بارے میں زہری کی روایت[79]، غزوۂ خندق[80]، بنی غطفان اور آنحضرتؐ کے مابین ہونے والی مصالحت[81]، غزوۂ بنی قریظہ[82]، اہل خزرج کا سلام ابن الحقیق کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرنا[83] وغیرہ روایات زہری کی سند سے بیان ہوئی ہیں۔ حدیث افک کے بعض ٹکڑے[84] اور اسی طرح صلح حدیبیہ

Marfat.com

اور بیعت رضوان کے سلسلے کے بعض ٹکڑے زہری کی مغازی سے ماخوذ ہیں[85]۔ ہدنہ کا واقعہ بھی زہری کی سند سے بیان ہوا[86] ہے۔ ابن اسحق نے چند آیات کا شانِ نزول معلوم کیا تو زہری نے اس کا جواب[87] دیا تھا۔ خیبر سے واپسی پر بلال کا نیند سے مغلوب[88] ہونا، خیبر سے یہودیوں کی بے دخلی[89] عکرمہ و صفوان کا قبول اسلام[90]، ذات انواط کا واقعہ[91]، غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ[92]، رسول اللہؐ کی بیماری[93]، انصار کے بارے میں آپ کی وصیت[94]، وفات کا دن[95] اور سقیفہ بنی ساعدہ میں مشورۂ خلافت[96] کی ساری روایات زہری کی سند سے بیان ہوئی ہیں۔

مذکورہ روایات سے یہ نتیجہ نکالنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے کہ زہری نے رسول اللہؐ کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات اپنی کتاب میں جمع کی تھیں بلکہ دیگر کتب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کے سامنے سیرت نبویؐ کا ایک مکمل نقشہ تھا جس کے لیے تفصیل سے اس موضوع پر مواد اکٹھا کیا گیا تھا مثلاً تاریخ طبری میں ایسی بہت سی تاریخی روایات ملتی ہیں جسے ابن ہشام نے اپنی کتاب میں درج نہیں کیا ہے۔ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ابن جریر نے ابن اسحق کے اصل نسخے کو سامنے رکھ کر زہری کی ان تمام روایات کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہو جسے ابن ہشام نے اپنے انتخابی نقطۂ نظر کے تحت ترک کر دیا مگر ابن اسحق نے تحریر کیا تھا لیکن اس پر اصرار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی تصدیق اس صورت میں ہوسکتی تھی جب ابن اسحق کی سیرت مکمل طور پر ہمارے پاس ہوتی۔ اس کے برخلاف ابن جریر الطبری کے یہاں ایسی روایات بھی ملتی ہیں جس کے سلسلۂ سند میں ابن اسحق کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی مغازی

Marfat.com

سے طبری نے کئی طریقوں سے استفادہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر وہ معمر بن راشد کو بھی نقل کرتا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معمر نے اپنی کتاب میں زہری کی مغازی سے نقل کیا تھا اور معمر کی مغازی طبری کے ہاتھ آگئی تھی۔ جس سے اس نے زہری کی بعض ان روایات کو نقل کیا ہے جو سیرت ابن اسحق میں موجود نہیں تھیں۔ اسی طرح طبری کبھی کبھی براہ راست زہری کو بطور سند کے پیش کرتا ہے جس کی بنا پر بجا طور پر ہمارا خیال اس طرف جاتا ہے کہ شاید طبری کو براہ راست زہری کی مغازی کا علم تھا اور اس سے استفادے کا موقع بھی ملا تھا۔ ایک اور ذریعہ معلومات کا ذکر طبری نے کیا ہے اور وہ ہے محمد بن سعد کا۔[97] اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد بن سعد نے اپنی کتاب مشاہد النبی میں زہری کی مغازی سے بعض روایات کو نقل کیا ہے[98] جسے طبری نے بعد میں استعمال کیا۔ اس موقع پر معمر بن راشد کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ اس نے مدینے میں زہری سے ملاقات کی تھی اور اس طرح اس کو زہری سے استفادے کا موقع ملا تھا۔[99] اس سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ معمر نے زہری کی مغازی کی بعض روایات بطریق سماعت بھی اس سے حاصل کی تھی تو اسے غیر علمی طریقہ استدلال نہیں کہہ سکتے۔

طبری نے زہری کی روایات کو کثرت سے نقل کیا ہے۔ ان میں ایسی روایات بھی ملتی ہیں جو کسی ماخذ کا پتہ نہیں دیتیں بلکہ طبری انھیں زہری کی سند سے نقل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزوۂ بنی قینقاع کا واقعہ اس طرح شروع کرتا ہے: "قال الزهری عن عروة نزل جبریل علی رسول اللہ بهذا الایة إلی آخرة"۔ یہ تو ایک مثال ہے ورنہ طبری نے کئی واقعات اسی طرح زہری کی سند سے بیان کیے ہیں۔ طبری کا یہ طریقہ ہے کہ جب وہ "قال فلاں"

Marfat.com

کے بعد واقعہ نقل کرتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے یہ روایت یا تو براہِ راست اس شخص سے سُنی ہے یا نہیں تو اس کی کتاب سے اخذ کی ہے۔ اس معاملے میں طبری کا زہری سے ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ البتہ اس کی کتاب سے براہِ راست استفادے کا قوی امکان موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ طبری نے اپنے استاد ابو داؤد الطیالسی عن ابراہیم بن سعد الزہری عن الزہری سے حاصل کی تھی[۱۰۱]۔ اسی طرح ایک اور ذریعہ یعنی یزید بن ہارون الواسطی جو اس کے استاد تھے ان کے ذریعہ بھی مغازی زہری ان تک پہنچی تھی۔

یہاں ان روایات کو مکمل طور پر درج کرنا جنھیں طبری نے زہری کی مغازی سے اخذ کیا تھا اس لحاظ سے موضوع سے متعلق ہے کہ اس سے زہری کے اس تصور کی جامعیت کا اندازہ ہوگا جو سیرت کے بارے میں وہ رکھتا تھا۔ جمعہ کی تقدیس کی روایت[۱۰۲]، تاریخ کی ابتدا[۱۰۳]، اہل مصر سے صہارت کی حدیث[۱۰۴]، ذبیح کا معاملہ[۱۰۵]، کسریٰ کے پاس فرشتے کا دعوت اسلام[۱۰۶]، قربان اولاد کا واقعہ[۱۰۷]، حضرت خدیجہ سے آنحضرت کی شادی[۱۰۸]، صنم بوانت[۱۰۹]، ابتداء وحی[۱۱۰]، فترۃ وحی[۱۱۱]، مسلم اول[۱۱۲]، اور کندہ و بنی عامر کو دعوت اسلام کے واقعات[۱۱۳] زہری کی مغازی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح تاریخ کا آغاز[۱۱۴]، اسعد بن زرارۃ کا واقعہ[۱۱۵]، سیرۃ عبداللہ بن جحش[۱۱۶]، ابتداء جنگ بدر[۱۱۷]، غزوہ بنی قینقاع[۱۱۸]، اوس وخزرج کی باہمی مسابقت[۱۱۹]، غزوۂ احد کا ذکر[۱۲۰]، بنی نضیر کا واقعہ[۱۲۱]، غزوۂ خندق[۱۲۲]، حدیث افک[۱۲۳] جیسے واقعات طبری نے زہری کی مغازی سے حاصل کیے ہیں۔ مزید یہ کہ صلح حدیبیہ[۱۲۴]، سفراء رسول کا ذکر[۱۲۵]، غزوہ بنی قریظۃ[۱۲۶]، دعوت رسول پر ہرقل کا تاثر[۱۲۷]، خیبر سے واپسی پر بلال پر نیند کا غلبہ[۱۲۸]، خیبر کے یہودیوں

کے کھجور کا معاملہ[129]، غزوۂ تبوک[130]، وفد کندہ[131]، رسول اللہ کا دلدل[132]، اسماء رسول[133]
بیماری کا ذکر[134]، وغیرہ کے واقعات زہری کی مغازی سے منقول ہیں۔ ابوبکر
کی فضیلت پر آنحضرت کے اقوال[135]، نیز آنحضرت کی وفات کے تفصیلی حالات
طبری نے زہری کی مغازی سے نقل کی ہیں[136]۔

طبری کے علاوہ ابن سید الناس نے بھی اپنی کتاب میں زہری کی روایات کو نقل کیا ہے۔ ان میں سے اکثر میں وہی مواد ہے جنھیں ابن اسحق اور طبری نے اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ بہت کم روایتیں ایسی ملیں گی جو ان معلومات میں اضافہ کرتی ہوں۔ مگر ڈھونڈھنے سے ایسی چند روایات مل جاتی ہیں جو نئی ہیں اور مذکورہ مورخین کی کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔ یہ روایات اس پہلو سے اہمیت رکھتی ہیں کہ ہم ان کے ماخذ کے بارے میں غور و فکر کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن سید الناس نے زہری کی مغازی سے استفادہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں جب ہم دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو خاص سیرت رسول پر لکھی گئی ہیں تو ان میں یہ روایتیں نہیں ملتیں۔ مثال کے طور پر شہر مکہ میں نبی ہاشم کا بائیکاٹ[137]، ابوطالب کے انتقال کے وقت ان کے قبول اسلام کے لیے آنحضرت کی خواہش[138]، مدینے میں اذن قتال[139]، بعثت رجیع[140] اور مسجد ضرار[141] کی روایات ہم کو ان کتابوں میں نہیں ملتیں۔ یہ واقعات زہری کی دیگر روایات کے ساتھ ابن سید الناس نے اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔ ان کا ماخذ بھی زہری ہے۔ اس مواد کی موجودگی سے یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ شاید زہری کی مغازی ابن سید الناس کے عہد میں بھی موجود رہی ہو جس سے اس نے استفادہ کیا ہو۔

محمد بن اسحق، ابن ہشام، طبری اور ابن سید الناس کی مذکورہ روایات

Marfat.com

پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ زہری کے ذہن میں سیرتِ نبوی کا ایک جامع خاکہ موجود تھا چنانچہ اس نے ہر پہلو پر تفصیل سے معلومات کو جمع کیا تھا۔ اس کو ہم مولف ہی نہیں کہیں گے بلکہ وہ محقق بھی تھا۔ واقعات کی تحقیق میں خاصی توجہ، تلاش اور سرگرمی سے کام لیتا تھا۔ اس سلسلے میں زبانی پوچھ گچھ کے علاوہ تحریری مسودات بھی حاصل کرتا اور انھیں اپنی کتاب میں جگہ دیتا تھا۔ مثال کے طور پر آنحضرت نے ملوک النائبین کے نام جو پیغامات بھیجے تھے اور جن لوگوں کے ذریعے بھیجے تھے، ان کے نام پیغامات کے مسودے کے ساتھ اس کو ملے تھے۔ یہ مسودہ یزید بن حبیب المصری نے زہری کے پاس بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ایسے ثقہ لوگوں کو کردیا تھا جو اس کی تصدیق کریں۔ زہری نے اس کی ثقاہت کو تسلیم کرکے پورے مسودے کو نقل کردیا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ زہری کو اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کا کس قدر خیال تھا۔

زہری نے آنحضرت کے کارناموں کی تصدیق یا تشریح کے لیے قرآنِ پاک کی آیات سے بھی استشہاد کیا ہے۔ اس سے بلاشبہ یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ آنحضرت کی زندگی اور قرآن کے مابین جو گہرا ربط ہے زہری کو اس کا شعور تھا۔ خاص طور پر غزوات کے بارے میں جو آیات نازل ہوئی تھیں انھیں اس نے بطور تشریح پیش کیا ہے[۱۴۳]۔ ایک اور خصوصیت کا زہری نے التزام کیا ہے۔ یعنی اس نے واقعات کو مرتب کرتے وقت ان میں تاریخی تسلسل کا لحاظ رکھا ہے۔

آنحضرتؐ کی زندگی عربوں اور دنیا کے دوسرے انسانوں کے لیے چشمۂ ہدایت تھی۔ اس لیے آپ کے اقوال و اعمال اور احکامات کی حفاظت

Marfat.com

متعدد اسباب کی بنا پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی مستحق تھی۔ چنانچہ زبانی یا تحریری طور پر اس مواد کو نقل کرنے والے محدث کہلائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان محدثین میں سے چند ایسے بھی گزرے ہیں جو ابتدا میں سیرت و مغازی کی روایات کے بھی مولف تھے۔ انھوں نے آپ کے اقوال کے علاوہ آپ کے کارناموں کو بھی معلوم کرکے حافظے یا تحریر میں محفوظ کیا تھا۔ مغازی کے یہ ابتدائی مولفین اس طریقے کی سختی سے پابندی کرتے تھے جو فن حدیث کی خصوصیت میں شامل ہے۔ یعنی اسناد کا طریقہ حدیث کی طرح مغازی میں بھی برتا گیا۔

زہری کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ اس نے اپنی مغازی میں ایسے واقعات کو شامل کرنے سے احتراز کیا ہے جن کے اندر قصہ گوئی کی رنگ آمیزی ہو۔ اس نے واقعات توڑ مروڑ کر یا مبالغے کے ساتھ پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ اسی بنا پر اس کے یہاں اسرائیلیات کا اثر نہیں پایا جاتا۔ اس کے ثبوت میں ہم اس مواد کو پیش کر سکتے ہیں جو مغازی کے موضوع پر اب تک ہمارے سامنے ہے۔ اس نے خلاف عقل خرق عادت جیسی باتوں کا ذکر کرنے سے بھی احتراز کیا ہے۔ پھر بھی دو ایک روایتیں ایسی مل جاتی ہیں جو اس کلیے میں استثنا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کی مثال کسریٰ کو فرشتے کا دعوت اسلام پیش کرنا ہے۔

زہری کی مغازی میں ایک اور خصوصیت ملتی ہے وہ یہ کہ اس نے اشعار کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شعر و ادب کے ذوق سے عاری تھا۔ وہ شعر و شاعری کا اچھا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اس کے بارے میں اغانی نے ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے

Marfat.com

جس سے زہری کے استادِ فن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک رات یزید کی لونڈی حبابہ چھت پر ایک شعر پڑھ رہی تھی۔ یزید نے پوچھا' یہ شعر کس کا ہے۔ اس نے جواب دیا' آپ کے سر کی قسم میں نہیں جانتی۔ یزید نے نوکر کو حکم دیا' جاؤ ابن شہاب الزہری کو بلا لاؤ۔ ممکن ہے انھیں اس کا علم ہو۔ زہری گھبرائے ہوئے یزید کے پاس آئے۔ اس نے پہلے تو اطمینان دلایا پھر پوچھا یہ شعر کس کا ہے۔ زہری نے جواب دیا' احوص بن محمد کا' یزید نے پوچھا اس شعر میں کس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ زہری نے بتایا کہ وہ عرصے سے قید و بند کی مشقت برداشت کر رہے ہیں' یزید نے کہا' مجھے تعجب ہے کہ حاکم مدینہ عمر نے ایسی غفلت سے کام لیا' پھر رہائی کا حکم دے دیا اور ساتھ ہی چار ہزار دینار بھی بھجوائے۔ زہری نے اسی رات آکر ان کے قبیلے انصار کو رہائی کی بشارت سنائی۔[۱۴۴] اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ زہری کو عربی شاعری کے سرمائے پر عبور حاصل تھا۔ اس شاعرانہ ملکہ کے باوجود زہری نے اپنی مغازی میں اگر اشعار استعمال نہیں کیے تو اس سے اس معروضی اندازِ فکر کا ثبوت ملتا ہے جو اس نے تاریخی مضامین کی ترتیب میں استعمال کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کا ہے کہ زہری کے پردادا عبداللہ بن شہاب اگرچہ معرکۂ بدر میں اہل مکّہ کے ساتھ تھے اور جنگ احد میں ان تین مکیوں کے ساتھ شریک تھے جنھوں نے آنحضرت کو زخمی بھی کر دیا تھا لیکن زہری جب اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں تو اس پہلو کا ذکر کرنے سے کتراتے ہیں۔

مغازی کے علاوہ زہری نے تاریخ صحابہ' تاریخ الخلفاء اور انساب جیسے مضامین میں گہری دلچسپی لی تھی اور ان موضوعات پر وسیع مواد اکٹھا

کیا تھا۔ اس کا اندازہ ان روایات سے ہوتا ہے جنھیں زہری کی سند سے ابن جریر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ مثلاً ابوبکر صدیق کے انتخاب کی پوری کارروائی[145]، خلیفہ ابوبکر کے پاس حضرت فاطمہ و حضرت عباس کا فدک کا مطالبہ پیش کرنا[146]، ابوبکر کی خلافت کا آغاز[147]، حضرت فاطمہ کی وفات[148]، خلیفہ کی بیماری[149]، خلیفہ کا ترک تجارت[150]، حضرت عمر کا سفر شام[151] اور بصرہ پہ ابوموسیٰ الاشعری کا تقرر امارت[152] جیسے واقعات طبری نے زہری کی سند سے نقل کیے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عمر کی شہادت[153] کی تاریخ، آپ کی عمر کے بارے میں روایت[154]، گھوڑے کا حلیہ[155]، ایک خطبہ کا بیان[156]، کوفہ اور بصرہ کے عہدۂ قضا پر تقرری کے بارے میں زہری کی روایت[157]، حضرت عثمان کے خلاف پروپیگنڈے کے حالات[158]، طبری نے زہری کی سند سے بیان کیے ہیں۔ مزید یہ کہ حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ[159]، آپ کا حلیہ[160]، حضرت علی کی بیعت[161]، حضرت طلحہ و زبیر کا مدینہ میں قتال کا مشورہ[162]، قیس بن عبادہ کا مصر کا گورنر ہونا[163]، محمد بن ابی بکر کا مصر آنا اور قیس کا خروج[164]، یوم حنین کا ایک واقعہ[165]، محمد بن ابی بکر کا اسباب قتل[166] اور اہل عراق کا حضرت حسن کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کے واقعات[167] زہری کی سند سے بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت حسن نے امیر معاویہ سے امن کا جو مطالبہ کیا تھا اس کا واقعہ بھی زہری کی سند سے بیان کیا گیا ہے[168]۔ ان روایات کے علاوہ بھی زہری نے ایسے واقعات تحریر کیے تھے جن کا تعلق ان کا اپنے زمانے سے ہے مثلاً سنہ ۸۲ھ میں مدینے کے والی کا ذکر[169]، ولید کا علماء کی عمریں دریافت کرنا[170]، عبدالعزیز بن مروان کا اپنے آدمی بھیج کر عبداللہ بن زبیر کو بلانا[171] اور ولید بن عبدالملک کے انتقال پر خود زہری کا تبصرہ[172] وغیرہ زہری کی سند سے

Marfat.com

نقل کیا گیا ہے۔ ان روایات سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس نے خلفاء راشدین اور خلفاء بنی امیہ کے ابتدائی عہد کے حالات جمع کیے تھے۔ مگر یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اس موضوع پر کوئی علحٰدہ کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ البتہ جب ہم زہری کی علمی دلچسپیوں کا حال کتابوں میں پڑھتے ہیں اور یہ روایت سامنے آتی ہے کہ اس کی کتابیں جانوروں پر لاد کر لائبریری میں داخل کی گئیں تو تھوڑی دیر کے لیے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اتنا وسیع علمی مواد کن موضوعات پر رہا ہوگا۔ ایک عالم جس نے تاریخ سے گہرے تعلق کا اظہار کیا ہو، اس پر کتابیں بھی لکھی ہوں، کیا اس سے یہ بعید ہے کہ اس نے اپنے عہد کے واقعات پر بھی قلم اٹھایا ہو۔ جب کہ اس کو ہر طرح کی سہولت بھی حاصل تھی۔ اس لیے زہری کے مسودات میں تاریخ الخلفاء پر کسی کتاب کا موجود ہونا بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے چھوٹے چھوٹے رسائل جو کثیر تعداد میں تھے علحٰدہ علحٰدہ موضوعات یعنی تاریخ صحابہ، تاریخ الخلفاء اور احداث اسلامی پر لکھے گئے ہوں جنھیں بعد میں مؤرخین نے بطور ماخذ کے استعمال کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہو کہ اس نے اپنی مغازی کا ایک حصہ تاریخ الخلفاء کے لیے مختص کر دیا ہو جس کے اندر زمانۂ صدر اسلام کے واقعات بیان کیے گئے ہوں۔ یہ قیاسات در اصل ایسی بنیادوں پر قائم کیے گئے ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

ایک امکان یہ بھی ہے کہ زہری نے اپنی کتاب "اسنان الخلفاء" میں ایسے واقعات قلم بند کر دیے ہوں جن کو مؤرخین نے استعمال کیا ہو۔ طبری کا بیان یہ ہے کہ زہری نے اپنے دادا کے لیے "اسنان الخلفاء" نام کی ایک کتاب مرتب کی تھی جس کو طبری نے استعمال کیا تھا۔[۱۷۳]

Marfat.com

صدر اسلام میں یہ عام رجحان تھا کہ علما ہر شاخ علم سے دلچسپی لیتے تھے بلکہ بعض تو ایسے بھی گذرے ہیں جو ایک ہی وقت میں کئی علوم میں اختصاص کا درجہ رکھتے تھے۔ یہی حال زہری کا بھی ہے۔ اس کو دیگر علوم کے علاوہ علم النسب سے بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس نے قبیلۂ مضر کا نسب نامہ لکھنا شروع کیا تھا مگر وہ مکمل نہ ہو سکا[۱۷۴]۔ اسی بنا پر قرۃ بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ زہری نے اپنے قبیلے کے نسب پر ایک کتاب تالیف کی تھی[۱۷۵]۔ اس سے مراد غالباً وہی کتاب ہے۔ زہری کی اس کتاب کی مدد سے معصب بن عبداللہ بن زبیر نے اپنی کتاب "نسب[۱۷۶] قریش" لکھی تھی۔ اس واسطے سے زہری کی کتاب کے کچھ ٹکڑے ہم تک پہنچے ہیں۔ زہری کی ایک اور کتاب کا سخاوی نے ذکر کیا ہے جس کا نام "مشاہد[۱۷۷] النبی" ہے۔ اس کتاب کو یونس بن یزید نے روایت کیا ہے۔ زہری کی احادیث کا ایک مجموعہ "الزہریات" کے عنوان سے بعد کے مولفین نے مرتب کیا ہے[۱۷۸]۔

مغازی زہری کی روایات کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہمیں اس کی چند امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ پہلی خصوصیت جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اسناد کی پابندی ہے۔ زہری نے حدیث کے اثر سے اسناد کو بڑے اہتمام سے ملحوظ رکھا ہے مگر کہیں کہیں اس سے بے توجہی بھی برتی گئی ہے[۱۷۹]۔ ایک اور اہم خصوصیت بلکہ ندرت یہ ہے کہ اس نے ایک ہی موضوع کی متعدد روایات کو جمع کر کے ایک روایت بنا دیا ہے اور ساتھ ہی تمام رواۃ کے نام درج کر دیئے ہیں[۱۸۰]۔ زہری نے یہ ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا اس کی بنا پر آنے والے مورخین کے لیے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ مختلف الطریق روایات کو ملا کر ایک ہی روایت تیار کر لیں کیونکہ تاریخ نگاری کے لیے یہی طریقہ

زیادہ موزوں ہے۔

زہری نے جو زبان استعمال کی ہے اسے ہم بے تکلف اور سادہ زبان کا اچھا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ اس معاملے میں اس نے اپنے استاذ عروۃ بن زبیر کی پیروی کی ہے۔ زبان کی یہ سادگی، بے تکلفی اور حسن بعد کے مصنفین کے یہاں باقی نہیں رہ سکا کیونکہ بعد کے لوگوں نے سیرت کے مضامین میں قصص و اساطیر کے عناصر بھی شامل کر دیے۔ افسوس نہ زہری کے رسالے، کتابیں، اور مسودے مرورِ زمانہ کی نذر ہو گئے، ان میں سے کوئی بھی اب موجود نہیں ہے ورنہ اس کی مدد سے ہمیں زہری کے مؤثر اور سادہ اسلوب بیان سے نہ صرف لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا بلکہ صدر اسلام کی علمی سرگرمیوں کا نمونہ بھی ہمارے پاس ہوتا جس کے ذریعے اس دور کے مذاق علم، معیار اور سب سے بڑی بات صدر اسلام میں عربوں کی معاشرتی، معاشی، اور اخلاقی زندگی کے چند اور گوشے منور ہو سکتے تھے۔ بہر حال ابن شہاب زہری نے سیرت و مغازی کے ابتدائی دور میں اس فن کی تدوین میں بہت اہم حصّہ لیا اور اس کا یہ کارنامہ تاریخ اسلام کے لیے قیمتی عطیہ تھا۔

زہری کے ہم عصر مولفین میں شرحبیل بن سعد[181] اور عاصم بن عمر بن قتادہ[182] کے نام خاص توجہ کے حامل ہیں۔ دونوں مدینہ کے رہنے والے تھے اور انھیں سیرت و مغازی کے مضمون سے گہری دلچسپی تھی۔ دراصل یہ لوگ اس علمی ماحول میں پلے تھے جس کی زینت عروۃ بن زبیر اور زہری تھے۔ اس بات کے امکانات بہت زیادہ ہیں کہ دونوں نے عروۃ بن زبیر سے سیرت و مغازی کے مواد کو اخذ کیا ہو۔ کیونکہ عروۃ کے انتقال کے وقت ان دونوں کی عمر عام اندازے کے مطابق ۳۰ سال سے کم نہیں رہی ہوگی۔

ان دونوں نے فن مغازی پر کتابیں تالیف کی تھیں جو انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ عاصم کی مغازی کے ٹکڑے دیگر کتب کے علاوہ سیرت محمد بن اسحٰق میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء مغازی ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔

ابن جریر الطبری نے عاصم کا تذکرہ ۱۴ جگہوں پر کیا ہے[۱۸۳]۔ یہ عاصم کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں ابن اسحٰق جیسا عالم مل گیا جس نے ان کی مغازی کے چیدہ چیدہ ٹکڑے اپنی کتاب میں نقل کرکے انھیں ہم تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ٹکڑے تاریخ طبری میں موجود ہیں۔ عاصم کی ابتدائی روایات بعثتِ نبوی اور آغاز اسلام سے تعلق رکھتی ہیں اور آخری روایت کا تعلق ۳۵ھ کے حوادث کے سلسلے میں ہے۔ ان سب روایات کا ذریعہ محمد بن اسحٰق ہے۔ ان کے علاوہ چند ایسی روایات بھی ہیں جو حضرت عثمان کے پرفتن دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ طبری نے ان کو محمد بن عمر واقدی کی سند سے بیان کیا ہے۔ مگر اس کے اندر اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ یہ کس کتاب سے ماخوذ ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ واقدی کی کتاب التاریخ والمغازی، کتاب السیرۃ یا کتاب التاریخ الکبیر[۱۸۴] میں سے کوئی ایک اس کا ماخذ رہی ہو۔

عاصم بن عمر سے محمد بن اسحٰق کی ملاقات ہوئی تھی اور ان کے حلقہ درس میں جس کا اہتمام پابندی سے مدینے کی ایک مسجد میں ہوتا تھا، شریک ہوتے تھے[۱۸۵]۔ عاصم نے مدینہ کے ان شیوخ سے استفادہ کیا تھا جو مغازی کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان لوگوں میں زہری کا نام خاص طور سے ممتاز ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زہری نے بھی عاصم سے سماعت کیا ہو کیونکہ دونوں ہم عصر اور ہم عمر بھی تھے۔ عاصم کا درس جو وہ مدینے میں

Marfat.com

دیا کرتا، کافی مشہور ہوتا تھا۔ اس کی افادیت اور شہرت کی بنا پر دور دراز کے تشنگانِ علم آکر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ ان مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں ایک قسم ایسے لوگوں کی تھی جو جمع ہوکر واقعات سنتے اور اپنے اعمال کی بہتری کے لیے ولولہ حاصل کرتے اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو علمی مقصد سے شریک ہوتے تھے۔ یہ لوگ جو کچھ سنتے، انھیں درج کر لیتے اس طرح ان کی بیاضیں سیرت کے لیے بطور خام مواد کے آیندہ مولفین کے لیے کام آئیں اور ان کی حیثیت ابتدائی ماخذ کی ہوگئی۔ عاصم ابن عمر اس اعتبار سے خاصے اہم ہیں کہ وہ قدیم اصحاب سیر اور جدید مولفین کے مابین بیچ کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سیرۃ رسول اللہ سے دلچسپی لینے والوں میں وہب بن منبہ الیمانی ایک دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ کیونکہ اس کی دلچسپی زیادہ ایسے مسائل سے رہتی تھی جو قصص و تواریخ قدیمہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس موضوع پر اس نے کافی معلومات جمع کی تھیں۔ اسی خصوصیت کی بنا پر اس کی شخصیت علماء اسلام میں ایک مخصوص کردار کی حامل ہے۔ وہب کی علمی سرگرمیاں خاصی تفصیل سے تذکرے کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اعزاء کتابیں خرید کر اس کے لیے جمع کیا کرتے تھے۔ جن کا وہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کا یہ دلچسپ دعویٰ تھا "میں نے ۳۰ کتابیں ایسی پڑھی ہیں جو ۳۰ انبیاء پر نازل ہوئی تحیں[۱۵۶]"

یہ مشہور ہے کہ وہب بن منبہ بڑا زاہد اور عابد انسان تھا[۱۵۷]۔ غالباً اسی زہد اور ورع کی بنا پر خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے اس کو صنعاء میں عہدۂ قضا، پر مامور کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہب نے کئی کتابیں تالیف کی تھیں جن میں

Marfat.com

سے ایک کتاب سیرت و مغازی کے موضوع پر تھی۔ اس کتاب کی طرف حاجی خلیفہ نے اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری نے BEKER بیکر کے اس نسخہ کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جس کو وہ وہب کی مغازی کا ایک ٹکڑا تسلیم کرتے ہیں۔ اس ٹکڑے میں بیعۃ العقبۃ الکبریٰ، حدیث قریش فی دارالندوۃ، ہجرت رسول اللہؐ، مدینے میں آپ کی آمد اور غزوۂ بنی خیثمہ کے واقعات درج ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہب نے یمنی نقطۂ نظر سے ان واقعات کو مرتب کیا تھا کیونکہ ان پر قصے کا رنگ غالب ہے اور ان میں سند کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ وہب کی یہ کتاب شاید اس لیے اہمیت اختیار نہ کرسکی کہ عام علماء سیرت اس موضوع پر اس کو مستند نہیں سمجھتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ سیرۃ و مغازی کے موضوع پر دیگر شہروں کے مقابلے میں مدینے کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ اصل اور حقیقی واقعات کے حفاظت کی ابتدائی کوشش یہاں سے شروع ہوئی جو بعد میں رفتہ رفتہ اپنے عروج کو پہنچ گئی اور اس موضوع پر بڑا وسیع مواد اکٹھا ہوگیا۔ اس لیے اہل مدینہ کو اس پر بڑا فخر تھا۔ اسی اولیت کی احساس کی بناپر شاید وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس گرانقدر سرمایے کو کسی دوسری جگہ منتقل ہونے دیں۔ اس لیے وہ ایسے لوگوں سے ان معلومات کو چھپاتے تھے جن کا تعلق دوسرے شہروں سے ہو کہ کہیں یہ لوگ لیجاکر اسے عام نہ کردیں اور اس طرح ان کی اولیت اور سبقت جاتی رہے۔ اس رویّے کے باوجود دوسرے شہروں میں بھی سیرت کے موضوع پر کام ہوا اور کئی ایسے عالم گزرے جنھوں نے مدینے سے باہر اس موضوع پر کام کیا بالخصوص معتمر سلیمان بن

Marfat.com

طرخان ابی المعتمر التیمی ۱۴۳ھ اور معمر بن راشد اسی قبیل سے گزرے ہیں۔[۱۸۹] معتمر سلیمان نے مغازی پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔[۱۹۰] جب وان کریمر نے واقدی کی کتاب المغازی کو دریافت کی اور اس کا بغائر مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا آخری حصّہ معتمر کی مغازی کا ٹکڑا ہے۔ اس کا تعین وہ "السیرۃ الصحیحۃ کما یقول الناسخ" سے کرتے ہیں۔

معتمر کی مغازی کا جو ٹکڑا ہمارے سامنے ہے اس سے ہم اس کتاب کے بارے میں کوئی متعین رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ معتمر نے غزوات رسول کے علاوہ بھی دیگر معلومات کو اپنی کتاب میں شامل کیا تھا۔ مثال کے طور پر آنحضرتؐ کے نسب، آپ کی مکّی زندگی اور دیگر کارناموں کے بارے میں اس سے کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ ٹکڑا صرف غزوات پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ معتمر نے غزواتِ رسول کے علاوہ بھی کسی اور نوعیت کی معلومات کو اپنی کتاب میں شامل کیا تھا۔ ابن جریر الطبری نے اپنی کتاب میں دو روایتیں معتمر کی سند سے نقل کی ہیں۔ ایک کا تعلق تخلیق آدم کے واقعہ[۱۹۱] سے اور دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم کو آگ میں جلانے کا ہے۔[۱۹۲] اس کے بعد معتمر کی سند سے حضرت عثمان کے دور کے چند واقعات درج کیے گئے ہیں جن کا تعلق فتنہ[۱۹۳] سے ہے۔ ان واقعات کی موجودگی میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے سیرت نبوی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہوگی اور ان سے متعلق واقعات قلم بند کیے ہوں گے۔ کیونکہ جتنے مولفین کتب سیرت گزرے ہیں ان سب کی کتابوں کا نہج بھی یہی تھا۔ معتمر کی یہ روایات جو ہم تک پہنچی ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں یمنی رنگ کی آمیزش پائی جاتی ہے

جس کا احساس تخلیق آدم والی روایت پڑھ کر ہوتا ہے۔

معمر بن راشد جو زہری کے مشہور شاگرد ہیں انھوں نے بھی کئی کتابیں تالیف کی تھیں[194]۔ چنانچہ ابن ندیم کا خیال ہے کہ معمر نے دیگر کتب کے علاوہ ایک "کتاب المغازی" کو بھی مرتب کیا تھا[195]۔ غالباً یہی کتاب ہے جسے ابن العماد "الجامع المشہور فی السیر" کے نام سے یاد کرتا ہے[196]۔ لیکن دوسری کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ شاید انھوں نے احداث اسلامی پر بھی قلم اٹھایا ہو۔ افسوس معمر کی کوئی بھی کتاب موجود نہیں ہے البتہ ان کی مغازی کے چیدہ چیدہ ٹکڑے واقدی، ابن سعد، بلاذری اور ابن جریر الطبری کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معمر نے اپنی کتاب میں عام نمونے کی پیروی کرتے ہوئے صرف غزوات سے متعلق ہی روایات قلم بند نہیں کی تھیں بلکہ سیرۃ نبوی کے تمام پہلوؤں پر مواد کو اپنی کتاب میں جگہ دی تھی۔ طبری نے اپنی تاریخ میں آنحضرت سے متعلق بعض ایسے واقعات قلم بند کیے ہیں جن کا تعلق قبل رسالت سے ہے۔ اس کے علاوہ فترۃ وحی[197]، اسعد بن زرارۃ کا واقعہ[198]، بنی نضیر کا معاملہ[199]، اور صلح حدیبیہ کے سلسلے کے بعض ٹکڑے انھیں کی مغازی سے منقول ہیں[200]۔

معمر بن راشد نے بائبل کے بعض قصوں کو بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے جنھیں ابن جریر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید معمر یمنی مدرسۂ فکر سے قریب تھا اسی وجہ سے اس کی تحریروں میں قصصی رنگ آگیا ہے مگر یہ اثر اتنا ہلکا ہے کہ اس کو ہم اہمیت نہیں دے سکتے اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بنیادی طور پر مدنی مکتب فکر سے زیادہ قریب تھا۔ اس کی نمائندہ خصوصیات کا حامل تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ

Marfat.com

معمر نے ہشام بن عروۃ اور زہری سے استفادہ کیا تھا[201]۔ ان کے اساتذہ میں ثابت البنانی، قتادہ اور عاصم الاحول شریک ہیں[202]۔ اس کے علاوہ یہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ انھوں نے مکہ مکرمہ میں عبدالکریم کی حدیث سماعت کی تھی[203]۔ اس سے پہلے یہ ذکر تو آہی چکا ہے کہ انھوں نے زہری سے براہِ راست استفادہ کیا تھا[204]۔

معمر ہشام بن عروۃ کے شاگرد تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اس ذریعے سے عروۃ بن زبیر کی ان معلومات سے جو مغازی کے موضوع پر انھیں حاصل تھیں استفادہ کیا ہو۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ معمر نے ان سے سنا ہو یا ان کی کسی تحریر سے نقل کیا ہو۔ اس لیے یہ رائے قائم کرنا ہمارے لیے آسان ہے کہ معمر کی مغازی پر مدنی خصوصیات کا اثر ہو۔ ان خصوصیات میں سے اہم خصوصیت زبان کی سادگی، سلاست اور سند کی پابندی ہے۔ ساتھ ہی یہ خصوصیت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ معمر نے جن معلومات کو اپنی کتاب میں درج کیا اس میں صداقت، تحقیق اور ثقاہت کا بڑا حصہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے مورخینِ سیرت نے اس کتاب سے بغیر کسی تنقید کے واقعات نقل کیے ہیں۔

ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ میں حضرت عثمان اور امیر معاویہ سے متعلق چند واقعات قلم بند کیے ہیں جن کا ماخذ معمر ہیں[205]۔ ان روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے خلفاء کے حالات اور واقعات سے دلچسپی لی تھی اور ان سے متعلق واقعات کو اپنی کتاب میں جگہ دی تھی۔ اس موقع پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا معمر نے اس موضوع پر کوئی علیحدہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کا ثبوت تذکرہ نویسوں کی کتابوں سے نہیں ملتا۔ وہ یہ نہیں بتاتے کہ معمر

Marfat.com

نے خلفاء کی تاریخ پر کوئی علیحدہ کتاب تصنیف کی تھی۔ لیکن ابن ندیم کا بیان ہے کہ " معمر کی کتابوں میں ایک کتاب المغازی بھی تھی۔"[۲۰۶] اس بیان کی روشنی میں یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ معمر نے کتاب المغازی کے علاوہ کئی اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی کا تعلق تاریخ الخلفاء سے بھی ہو۔

سیرت نبوی کے موضوع پر کتابیں تالیف کرنے والوں کے اس گروہ کا ایک ممتاز رکن موسیٰ بن عقبہ بھی ہے۔[۲۰۷] اس نے مدینے کی علمی شہرت کو چار چاند لگانے میں اہم کارنامہ انجام دیا اور اس ادب میں اپنی قیمتی تالیف کے ذریعے اہم اضافہ کیا۔ موسیٰ بن عقبہ کے بارے میں یہ اطلاع نہیں ملتی کہ انھیں زہری کی شاگردی کا موقع ملا تھا یا نہیں۔ البتہ مدینے میں ان کی موجودگی اور زہری کا قیام اس امکان کو کافی تقویت پہنچاتا ہے کہ شاید موسیٰ کو زہری کی شاگردی کا موقع ملا ہو۔ موسیٰ کے تابعی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایک صحابیۃ سے ملاقات کی تھی۔[۲۰۸] اس طرح وہ تابعی کہلانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ نے مغازی کے موضوع پر جو کتاب تصنیف کی تھی اس کی وجہ تالیف کے بارے میں ایک دل چسپ واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ شرجبیل بن سعد جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، سیرت و مغازی کے عالم تھے۔ ان کے بارے میں یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ وہ شرکاء بدر و احد کی فہرست میں غلط ناموں کو شامل کر دیتے ہیں۔ جب اس کا ذکر موسیٰ بن عقبہ کے سامنے ہوا تو انھیں اس سے تکلیف ہوئی اور باوجود کبر سنی کے انھوں نے اس کتاب کی تالیف پر کمر ہمت باندھ لی۔ انھوں نے ایسے لوگوں کی صحیح فہرست

Marfat.com

مرتب کی جو جنگِ بدر، جنگ احد میں شریک تھے اور جنھوں نے حبشہ اور مدینے کی ہجرت میں شرکت کی تھی۔[۲۰۹]

موسیٰ بن عقبہ کی ثقاہت پر تقریباً سبھی لوگوں کا اتفاق ہے۔ ذہبی ان کو معتمد علیہ مانتے تھے[۲۱۰]۔ احمد بن حنبل ان کی روایتوں کو ثقہ سمجھتے تھے۔ ان کا مشورہ تھا کہ موسیٰ کی مغازی سے لو کیونکہ وہ قابلِ ثقہ ہے[۲۱۱]۔ ذہبی نے اس کو علی ابو النصر الفارسی سے سماعت کیا تھا[۲۱۲]۔ ابن العماد نے اس کتاب کی تعریف کی ہے اور اپنے دور میں اس کے وجود کی تصدیق کی ہے[۲۱۳]۔ سخاوی نے موسیٰ بن عقبہ کے شاگرد امام مالک کا قول نقل کیا ہے جس کے ذریعے انھوں نے اس کتاب کی تعریف کی ہے[۲۱۴]۔ البتہ ابن معین کی رائے موسیٰ کی ثقاہت کے خلاف ہے[۲۱۵]۔ اس کے باوجود موسیٰ کے بعد سیرت و مغازی پر کام کرنے والے تمام مصنفین نے اس کی کتاب کو معتبر تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ موسیٰ کی مغازی کو متعارف کرانے والوں میں اس کے پوتے اسماعیل بن ابراہیم نے بڑی سرگرمی دکھائی تھی۔[۲۱۶]

موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا اصل نسخہ اب نایاب ہے[۲۱۷]۔ البتہ اصل مسودے سے منتخب احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا تھا جو مطبوعہ شکل میں موجود ہے[۲۱۸]۔ اس کا اصل نسخہ پروشین اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے جس کو جرمن ترجمے کے ساتھ سخاو نے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ البتہ اس کی مغازی کے ٹکڑے واقدی کی کتاب المغازی، ابن سعد کی کتاب الطبقات اور ابن جریر کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنے استاد واقدی کے ذریعے موسیٰ کی روایات کو نقل کیا ہے[۲۱۹]۔ واقدی نے متعدد واقعات اس کتاب سے نقل کیے ہیں۔ لیکن ابن جریر نے موسیٰ کی ان معلومات سے استفادہ کیا ہے جن کا تعلق خلفاء راشدین

Marfat.com

اور اموی عہد سے ہے۔[۲۲۰] اس نے سیرت کے موضوع پر اتنا کم نقل کیا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اصفہانی نے اپنی کتاب کتاب الاغانی میں تاریخ عہد جاہلیت سے متعلق کئی واقعات موسیٰ کی مغازی سے حاصل کیے تھے۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ کی مغازی میں دور جاہلی کے حالات بھی مندرج تھے۔[۲۲۱]

موسیٰ کی مغازی کے چیدہ چیدہ ٹکڑے جو سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں ان کے مطالعے سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ وہ سیرت نبوی کا ایک مکمل نقشہ اپنے ذہن میں رکھتا تھا۔ اسی نقشے کے مطابق اس نے نبی اکرم کی پوری زندگی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ان روایات سے موسیٰ کے تحقیقی ذوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ غزوات اور جنگوں میں شریک اشخاص کی جو فہرست اس نے اپنی مغازی میں فراہم کی ہے وہ اس کی عالمانہ شان اور محققانہ انداز فکر کا پتہ دیتی ہے۔ اس نے حبشہ ہجرت کرنے والوں کی فہرست، بیعت عقبہ میں شرکاء کی تعداد اور غزوۂ بدر میں شریک صحابۂ کرام کے اسماء کو تحقیق سے فراہم کیا ہے۔[۲۲۲] اسی خصوصیت کی بنا پر عقبہ کی مغازی کا مرتبہ اونچا ہو گیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ کی مغازی بعض نمایاں خصوصیات کی حامل تھی۔ مثال کے طور پر اس نے صحیح ناموں کی فہرست ہی مرتب نہیں کی بلکہ اس نے واقعات کو بیان کرتے وقت سند کی بھی پابندی کی ہے۔[۲۲۳] شاید ہی کوئی روایت بغیر سند کے درج کی گئی ہو۔[۲۲۴] یہ مدنی مکتب فکر کی خصوصیت تھی کہ وہ اسناد کی پابندی کرتے تھے مگر کبھی کبھی اس سے غفلت بھی کر جاتے تھے۔ لیکن موسیٰ نے اس کی جانب خصوصی توجہ دی اور اسناد کی پابندی کا

Marfat.com

سختی سے اہتمام کیا۔ موسیٰ نے واقعات کی تحقیق میں مستند ماخذ کی طرف رجوع کیا اور انھیں اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر دیگر کتب سیرت کے علاوہ اس نے ابن عباس کے مسودات سے بھی استفادہ کیا تھا۔[۲۲۵] یہ ثبوت ہمارے تخیل کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتا ہے کہ مدینہ عرصے تک سیرت و مغازی، تاریخ صحابہ وخلفاء کے مواد کا بنیادی مرکز رہا ہے۔ اور اس شہر میں اس موضوع پر وسیع ادب اصلی حالت میں ملتا تھا۔ سرکاری وغیر سرکاری کاغذات، مسودات، بیاضیں، وساتیر اور مولفات بڑی تعداد میں علماء کے لیے میسّر تھیں۔ چنانچہ موسیٰ نے اس مواد سے استفادہ کیا اور بعض اصلی مسودات حاصل کرکے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔ مثال کے طور پر منذر بن ساوی کے پاس آنحضرتؐ نے جو خط بھیجا تھا اس کو موسیٰ نے حرف بحرف نقل کیا ہے۔[۲۲۶] ان اعلیٰ خصوصیات کے علاوہ بعض ایسی مثالیں بھی اس کے یہاں ملتی ہیں جو وقت کے اثر کا پتہ بھی دیتی ہیں مثلاً اشعار وغیرہ نقل کرنے کا۔[۲۲۷]

سیرت و مغازی کے میدان میں مذکورہ ادبی سرگرمیاں ارتقاء کے منازل طے کرتے ہوئے اب ایک خاص منزل تک پہنچ گئی تھیں۔ اس منزل کو ہم نسبتاً زیادہ پختگی، فنی کمال اور باضابطگی کی منزل سے موسوم کرسکتے ہیں۔ اس وقت ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس انداز سے دلچسپی لے کر اب تک کے تمام ارتقائی مراحل اور خصوصیات کو اپنے اندر سمیٹ کر اسے علمی اعتبار اور فنی کمال عطا کرے۔ اس کام کے لیے محمد بن اسحٰق جیسا زبردست عالم، محقق اور جویائے علم درکار تھا جو اب تک کی تمام معلومات کو تلاش کرکے رطب ویابس میں فرق کے ساتھ تنقید و تحقیق کی روشنی میں ایک

Marfat.com

جامع کتاب مرتب کرے جس کے اندر سیرتِ نبوی کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہ پائے اور آپ کی ذات سے متعلق تمام مواد سلیقہ کے ساتھ یکجا کر دے۔ بلاشبہ اس فرض کو محمد بن اسحق نے بڑی حد تک انجام دیا۔ اس نے بڑی دیدہ ریزی، تلاش و جستجو، ذہانت، ایمانداری اور تحقیقی عمل کے ساتھ اپنی مغازی کو مرتب کیا۔

محمد بن اسحق بن یسار[۲۲۸] مدینے کے رہنے والے اور زہری اسکول یا وسیع معنوں میں مدنی مکتب فکر کے نمائندے تھے۔ ان کا شمار تابعین میں بھی ہوتا تھا کیونکہ اس نے حضرت انس کو دیکھا تھا۔[۲۲۹] لیکن ان سے روایت بھی کی تھی یا نہیں، اس کی شہادت نہیں ملتی۔ ابن اسحق کو زہری کی شاگردی کا نہ صرف یہ کہ فخر حاصل تھا بلکہ زہری کی روایات کا مستند ترین راوی ہمارے سامنے یہی شخصیت ہے۔ ساجی کا خیال ہے کہ زہری کے تلامذہ ایسے موقعوں پر جب انھیں کسی حدیث یا روایت کے بارے میں شبہ ہوتا تھا تو وہ محمد ابن اسحق کی طرف رجوع کرتے تھے کیونکہ انھیں اس کے حافظے پر بھروسہ[۲۳۰] تھا۔ وسعتِ علم کی بنا پر لوگ اسے دریا سے تشبیہ دیتے تھے۔ عاصم بن عمر کا خیال ہے "جب تک محمد بن اسحق زندہ ہے لوگوں میں علم باقی رہے گا"۔[۲۳۱] ابن العماد کی رائے ہے "محمد بن اسحق علم کا دریا ہے"۔[۲۳۲] شعبة کا خیال ہے کہ فن حدیث میں اس کا درجہ امیر المومنین کا ہے۔[۲۳۳] اس کے برخلاف ابن معین کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تو ہے لیکن اسے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ محمد بن اسحق حدیث میں حسن کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

محمد بن اسحق کی ثقاہت کے بارے میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں۔ ایک قابلِ ذکر گروہ ایسا بھی ہے جو ابن اسحق کو ضعیف سمجھتا ہے۔ خاص طور پر

محدثین سے اس کی چشمک زنی مشہور ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو کمزور اور مشکوک ٹھہراتے ہیں۔ غالباً محمد بن اسحق پر تنقید کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاید وہ محدثین کے ان اصولوں پر نہ اُترتے رہے ہوں جنھیں وہ احادیث کی جانچ و پرکھ کے لیے ضروری سمجھتے تھے اور جسے انھیں کے ذہن و فکر نے وضع کیا تھا۔ حالانکہ ان اصولوں کے تمام تر صحیح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ نقد و جرح کے متعین اصول جو انسانی ذہن اور سماجی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں، وہ خود بھی اپنی نوعیت، اہمیت اور حیثیت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ حقیقت اور صحت تک پہنچنے کے لیے ظاہر ہے کہ معیارِ تنقید ہمیشہ ایک ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ غالباً ابن اسحق کے خلاف محدثین کے عام رویے کی بنا پر امام بخاری نے کوئی حدیث اس کی سند سے اپنی کتاب میں درج نہیں کی ہے لیکن مسلم میں شاید دو ایک حدیث مل بھی جاتی ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابن اسحق کے ناقدوں کی کیا منشا تھی۔ بعض لوگوں نے اس پر تشیعت کا الزام بھی لگایا ہے مثلاً شاذکونی، اور احمد بن یونس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔[۲۳۴] اس کے بارے میں یہ خیال بھی پایا جاتا تھا کہ وہ اپنے خیالات کے اعتبار سے قدری ہے اور وہی کیا غالباً اس تصوّر سے اموی دور کے بیشتر مؤلفین متاثر تھے۔ اس لیے اگر ابن اسحق بھی اس فکر کا حامل رہا ہو تو کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی بنا پر ابن اسحق پر کوڑے برسائے گئے اور یہ کام ابراہیم بن ہشام نے انجام دیا تھا۔[۲۳۵]

محمد بن اسحق کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی بیویوں کے متعلق کبھی کبھی نہایت غیر ذمہ داری سے غزلیں لکھ دیتا تھا۔ جب اس کی

Marfat.com

اس حرکت کی اطلاع مدینہ کے حاکم کو پہنچی تو اس نے بلا کر اس کے بال کٹوائے اور کوڑے بھی لگوائے۔[۲۳۶] چنانچہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ہشام بن عروۃ کی بیوی فاطمہ بنت المنذر کی سند سے وہ روایت کیا کرتا تھا۔ جب اس کی اطلاع ہشام کو پہنچی تو انھوں نے اس کے اس عمل کی سختی سے تردید کی اور کہا کہ جب ابن اسحق نے میری بیوی کو دیکھا ہی نہیں اور نہ ان سے کچھ سنا تو وہ کیسے روایت کرتا ہے۔[۲۳۷] اس موقع پر اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابن ندیم نے ابن اسحق کے بارے میں جو واقعہ نقل کیا ہے اس سے اس کی اچھی تصویر سامنے نہیں آتی۔ اس کے برخلاف یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ نے اس کی ثقاہت کے بارے میں مثبت کلمات کہے ہیں۔ ذہبی نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ ابن اسحق میرے نزدیک حسن الحدیث صالح الاعمال اور سچا ہے۔[۲۳۸]

محمد بن اسحق نے سیرۃ و مغازی کے علاوہ تاریخ الخلفاء کے موضوع سے دلچسپی لی تھی۔ اس موضوع پر اس نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ چنانچہ ابن ندیم کتاب السیرۃ والمبتداء والمغازی کے علاوہ کتاب الخلفاء کا بھی ذکر کرتا ہے۔[۲۳۹] محمد بن اسحق کی مغازی کا اصل نسخہ ناپید ہے۔[۲۴۰] مورخین نے ابن اسحق کی کتاب المغازی کی وجہ تالیف یہ تحریر کی ہے: "ایک بار محمد بن اسحق حیرۃ میں ابوجعفر کے پاس حاضر ہوا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں خلیفہ کا لڑکا مہدی بھی موجود تھا۔ ابن اسحق نے لڑکے پر ایک نظر ڈالی تو خلیفہ نے سوال کیا کہ تم اس لڑکے کو پہچانتے ہو؟ ابن اسحق نے جواب دیا۔ ہاں یہ امیر المومنین کے صاحبزادے ہیں۔ اس کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ جاؤ اس لڑکے کے لیے تاریخ پر ایک کتاب لکھ لاؤ جس کا آغاز

Marfat.com

تخلیق آدم سے اور اختتام عہدِ حاضر پر ہو۔ ابن اسحق نے اس حکم کی تعمیل کی اور ایک کتاب لکھ کر حاضر کی۔ خلیفہ نے اس کو دیکھ کر کہا" ابن اسحق یہ تو بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اس کو ذرا مختصر کر لاؤ۔ اور اس نسخے کو اپنے پاس رکھ لیا۔[۲۴۱] ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ابن اسحق نے بہت پہلے کتاب کو مکمل کر کے سلمۃ بن الفضل کے حوالے کر دیا تھا۔[۲۴۲] بعض نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ ابن اسحق کی کتاب مدنی مکتب فکر کی حامل تھی اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نے اس کتاب کو مدنی ماحول میں مرتب کیا ہو اور مدینہ چھوڑنے سے پہلے ہی اس کی تکمیل کر لی ہو۔ جان فوک جس نے محمد بن اسحق پر ایک مبسوط رسالہ تصنیف کیا ہے۔ اس میں وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔[۲۴۳] ڈاکٹر جواد علی نے اپنے محققانہ مقالہ" تاریخ طبریؒ کے ماخذ" میں جان فوک کے اس خیال کی تائید کی ہے اور اس مسئلے پر بروکلمان کو بھی اپنا ہم نوا پایا ہے۔ محمد بن اسحق جب مدینہ چھوڑنے لگے تو اپنے ساتھ اس نسخے کو لیتے گئے اور راستے میں عراقی علماء کو اس کے روایت کی اجازت دی۔ جب وہ منصور کے دربار میں پہنچا تو اس کا ایک نسخہ خلیفہ کو بھی پیش کیا۔ اسی سفر میں وہ جزیرۃ میں عباس بن محمد کے پاس پہنچے جہاں لوگوں نے اس کی کتاب سے استفادہ کیا اور کئی لوگوں نے روایت کی اجازت حاصل کی۔ خلیفہ کے پاس ہوتا ہوا وہ الری پہنچا جہاں کے علماء نے اس سے سماعت کی۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ ان شہروں کے راوی تعداد میں اسی لیے زیادہ ہیں۔[۲۴۴] لیکن میری رائے میں محض یہی وجہ کثرت رواۃ کی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مدینے کے دوران قیام میں

Marfat.com

وہ آخر تک حذف و اضافہ کرتا رہا۔ شاید اس لیے مصنف نے روایت کی عام اجازت نہیں دی تھی لیکن جب وہ مدینے سے رخصت ہوئے تو وہ حذف و اضافے کی گنجایش سے مطمئن ہو گئے اور آخری طور پر اس کو مکمل کر لیا۔ سلمۃ بن الفضل کے نسخے کے مستند ترین ہونے کا غالباً یہی مطلب بھی ہے کہ وہ مدینہ چھوڑنے کے بعد سیرۃ کا آخری اور مکمل نسخہ سلمۃ کو دے گئے۔

محمد بن اسحٰق کی کتاب کو پھیلانے اور اس کو قبولیت عام کا درجہ حاصل کرانے میں در اصل اس کے ان ۱۵ شاگردوں کا بڑا حصہ ہے جنھوں نے سیرت کی کتاب روایت کی۔[۲۴۵] ان شاگردوں میں مستند ترین شاگرد سلمۃ بن الفضل ہیں۔[۲۴۶] یہ شہر الری کے قاضی اور ابن اسحٰق کے دوست تھے۔ دوسرے مشہور راوی یونس بن بکیر بن واصل ابو بکر الشیبانی ہیں۔ یہ بھی مغازی کے عالم اور مولف تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۹ھ میں ہوا۔ ابن الاثیر اور ابن حجر[۲۴۸] نے یونس بن بکیر ہی کے نسخے کو استعمال کیا ہے۔ تیسرے راوی یحیی بن سعید الاموی ہیں یہ بھی محمد بن اسحٰق کے معتمد علیہ شاگرد اور کوفہ و بغداد کے رہنے والے تھے۔[۲۴۹] ایک اور راوی عبد الرحمن بن محمد بن زیاد الکوفی ہیں۔ ان کا ۱۹۵ھ میں انتقال ہوا تھا۔[۲۵۰] ابراہیم بن سعد بن ابراہیم بن عوف الزہری متوفی ۱۸۲ھ یا ۱۸۵ھ ایک مشہور عالم گزرے ہیں۔ ان کا وطن مالوف مدینہ تھا اور ابن اسحاق کے ساتھی تھے۔ بعد میں بغداد چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے بھی ابن اسحٰق کی سیرۃ روایت کی تھی۔[۲۵۱] ابن سعد نے سیرۃ کا جو نسخہ اپنی کتاب الطبقات میں استعمال کیا تھا وہ انھیں کی سند سے ہے۔ ابن سعد نے ابن اسحٰق کا ایک اور نسخہ

Marfat.com

ہارون بن ابی عیسیٰ الشامی سے حاصل کیا تھا۔ یہ شخص ابن اسحق کا سکریٹری اور ان کے راویوں میں شامل تھا۔[۲۵۲]

ابن اسحق کے شاگردوں کی طرح اس کے اساتذہ کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے جو ۱۴۱ تک پہنچتی ہے۔ یہ تعداد دراصل بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس زمانے کے نظام تعلیم کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تحصیل علم کے لیے عمر کی قید نہ تھی۔ بلکہ حصول علم کو بطور پیشہ زندگی اختیار کیا جاتا تھا۔ اس لیے علماء عمر کے آخری حصے تک تحصیل علم میں لگے رہتے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس لیے اس نظام تعلیم کے تحت ابن اسحق کے اساتذہ کی یہ تعداد جو معلوم ہو سکی ہے زیادہ نہیں ہے۔ ابن اسحق کے اساتذہ کی فہرست مرتب کرتے وقت اس کے باپ کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ محمد نے اپنے باپ اسحق سے بھی حدیث کی تعلیم پائی تھی۔ محمد بن اسحق کے چچا موسیٰ بھی حدیث پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ اس نے ان سے بھی استفادہ کیا تھا اگرچہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ابن اسحق نے اپنے باپ کا ذکر کیا ہے۔[۲۵۳] عبدالرحمٰن بن ابی بکر متوفی ۱۳۶ھ ابن اسحق کے استاذ تھے۔ ابن اسحق نے اس کا اعتراف کیا ہے۔[۲۵۴] ایک اور استاذ یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن الزبیر بھی ہیں۔[۲۵۵] اسی طرح محمد بن جعفر بن الزبیر،[۲۵۶] نافع مولی ابن عمر،[۲۵۷] عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج،[۲۵۸] محمد بن ابراہیم التیمی،[۲۵۹] عبداللہ بن ابن نجیح،[۲۶۰] ہشام بن عروۃ،[۲۶۱] یزید بن ابی حبیب المصری،[۲۶۲] سعید المقبری،[۲۶۳] یحییٰ بن سعید الانصاری[۲۶۴] شعبۃ بن الحجاج[۲۶۵] اور روح بن القاسم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابن اسحق کے اساتذہ میں ابن شہاب الزہری کا نام سرفہرست ہے۔

Marfat.com

ابن اسحٰق نے اپنی کتاب کو تین اجزاء میں تقسیم کیا تھا۔ ایک کو کتاب المبتداء، مبداء یا مبتداء الخلق کہتے تھے۔ اس حصے میں تخلیق کائنات سے لے کر بعثت رسول اللہ ؐ کے وقت کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس حصے میں انبیاء اور اقوام ماضیہ کی تاریخ بھی شامل تھی۔ دوسرا حصہ کتاب المغازی کا تھا۔ اس حصے میں بعثت نبوی کے عہد سے لے کر وفاتِ نبوی تک کے حالات درج تھے۔ اور تیسرے حصے کو ہم کتاب الخلفاء کہہ سکتے ہیں جو سیرت کی کتابوں میں شامل نہیں ہے اور اس حصے سے مورخین نے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ پہلے حصے میں آنحضرتؐ کے قریبی اجداد کا تذکرہ بھی کیا تھا جسے ابن ہشام نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور باقی حصے کو مطلقاً نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن ابن ہشام کے علاوہ دیگر مورخین نے اس حصے کے بیشتر مواد کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مثال کے طور پر ازرقی اور ابن جریر الطبری نے اپنی کتابوں میں اس کا تفصیلی مواد نقل کر کے ضائع ہونے سے بچا لیا ہے۔ ازرقی نے تاریخ مکہ سے متعلق روایات اسی حصے سے نقل کی ہیں۔ طبری نے تاریخ الانبیاء اور دیگر ضروری موضوعات کے لیے اسی حصے کو اپنا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ جو سیرت نبوی اور مغازی سے متعلق تھا اس کو ابن ہشام نے تفصیل سے بلکہ صحیح معنوں میں اس کا خلاصہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ واقدی، محمد بن سعد، ابن جریر الطبری، ابن الاثیر اور ابن سید الناس وغیرہ نے اس حصے کو اپنی کتابوں کا ماخذ بنایا ہے۔ اس حصے میں رسول اللہ کا نسب، ولادت، مکہ کی زندگی، بعثت اور ہجرت مدینہ سے متعلق واقعات جمع کیے گئے ہیں۔ ابن اسحٰق

نے اس حصّے میں اسناد کی پابندی کی ہے اور اسی حصّے میں اپنے ان مدنی اساتذہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ان واقعات کو اُسے فراہم کیا تھا۔ اس کے علاوہ اہم اور اصل مسودات بھی حاصل کرکے نقل کیے گئے ہیں۔ اس نے حضرت ابوبکر کی تبلیغ سے اسلام قبول کرنے والوں کی فہرست بھی پیش کی ہے[۲۶۶]۔ ابن اسحٰق نے مغازی کے باب میں بھی کئی فہرستیں درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کی فہرست جو غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے تھے۔ اسی طرح خندق، خیبر، موتہ اور طائف کے شرکاء کی تعداد کو بھی مرتب کرکے نقل کیا ہے[۲۶۸]۔ بعض فہرستوں میں تکرار بھی پائی جاتی ہے مثلاً حبشہ ہجرت کرنے والے جو لوٹ کر واپس آئے ان کی فہرست دوبارہ پیش کی گئی ہے۔

محمد بن اسحٰق کی کتاب کا تیسرا حصہ جسے کتاب الخلفا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے غالباً زیادہ شہرت حاصل نہ کرسکا۔ کیونکہ بہت کم مورخین نے اس حصّے سے نقل کیا ہے۔ ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ میں کہیں کہیں اس کتاب سے نقل کیا ہے۔ مثلاً خلفاء راشدین، خلافت معاویہ اور بنی امیہ کے ابتدائی دور کے تاریخی حالات اس کتاب سے نقل کیے گئے ہیں[۲۶۹]۔ ابن جریر نے ان معلومات کو اپنے استاذ محمد بن حمید سے حاصل کیا تھا۔ اس موقع پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ خلافت راشدہ اور سیرتِ معاویہ کے بارے میں ابن الاثیر بعض ایسی اطلاعات فراہم کرتا ہے جو نہ تو تاریخِ طبری میں پائی جاتی ہیں اور نہ کسی اور کتاب میں۔ اس لیے زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ابن الاثیر نے معلومات کے لیے ابن اسحٰق کی کتاب کے اس حصّے کو اپنا ماخذ بنایا ہو

Marfat.com

کیونکہ ابن اسحٰق کی کتاب کا ایک مکمل نسخہ اس کے پاس موجود تھا۔

ابن اسحٰق کی کتاب میں کثرت سے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو وہ پوری کتاب کے ⅕ حصے کے برابر ہے۔ یہ تو وہ ہے جو ابن ہشام کی کتاب میں درج ہے۔ اصل کتاب میں اس کا تناسب کیا رہا ہوگا، اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان اشعار کا اصل واقعات سے کس حد تک تعلق رہا ہے، یہ خود بخود عیاں ہے۔ دراصل اس کا بڑا حصہ جعلی اور حقیقی واقعات سے غیر متعلق ہے۔ لوگ اشعار گڑھ کر ابن اسحٰق کو دیتے اور یہ انھیں موقع بے موقع کھپا دیتا تھا۔[۲۷] اشعار کے جعلی ہونے کا احساس اس کے عہد میں پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ رواۃ شعر اور ناقدین نے کھل کر اس پر تنقید کی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ابن اسحٰق انھیں کیسے قبول کر لیتا اور بغیر تحقیق و تنقید کے اپنی کتاب میں نقل کر دیتا تھا۔ غالباً اسی کمزوری کی بنا پر ابن ہشام نے بہت سے اشعار نقل کرنے سے احتراز کیا تھا۔ ابن اسحٰق کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے انساب کی جدولیں ترتیب کرتے وقت فحش غلطیاں کی ہیں۔ جس کی طرف اس موضوع کے ماہرین نے اشارہ کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ انساب کی روایات میں خود اتنا تضاد ہے کہ صحیح و غلط میں فرق کرنا خاصا پریشان کن مسئلہ ہے اور یہی مشکل ابن اسحٰق کو پیش آئی ہوگی۔ ابن اسحٰق کی کتاب کے حصے جو انساب، قومی قصص، سیر الانبیاء، احداث اسلام اور خلفاء راشدین وغیرہ سے متعلق ہیں اور جو متعدد تاریخی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کرنے سے ان ارتقائی مراحل، خصوصیات اور رجحانات کی نشان دہی ہوتی ہے۔

Marfat.com

جو اس دور کے جزیرۃ العرب میں الگ الگ نشو ونما پا رہے تھے۔ ابن اسحٰق نے نہ صرف یہ کہ اپنے سے بیشتر مورخین کے اکٹھا کیے ہوئے مواد کو جمع کیا بلکہ اپنے ہم عصر دوسرے مورخین کی روایات کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ مثلاً تاریخ الانبیاء کے مواد کو اکٹھا کر کے انھیں بعثتِ نبوی سے جوڑ کر اس حقیقت کا ثبوت فراہم کیا کہ نبوت محمدی ایک طویل تاریخی سلسلے نبوت کی ایک کڑی ہے۔ تاریخ الانبیاء کے موضوع پر تحریری مواد کے علاوہ اس نے یہودی اور عیسائی علماء سے زبانی معلومات بھی حاصل کیں۔ اس کے دوستوں میں اچھی خاصی تعداد عیسائی اور یہودی علماء کی بھی تھی جن کے ذریعے وہ ان مذاہب کے بارے میں معلومات حاصل کرتا تھا۔ ذہبی نے ابن ابی فدیک کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "میں نے ابن اسحٰق کو دیکھا کہ وہ ایک اہلِ کتاب سے کچھ پوچھ کر لکھ رہا تھا۔"[271] ابن ندیم بھی لکھتا ہے کہ ابن اسحٰق یہود و نصاریٰ سے معلومات حاصل کرتا تھا۔[272]

ابن اسحٰق اس تاریخی مواد سے بھی دلچسپی رکھتا تھا جسے ہم خبر کہتے ہیں۔ اس نے اقوام ماضیہ کی تاریخ سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے جس کی تصدیق اس مواد سے ہوتی ہے جو اس نے اپنی کتاب میں فراہم کیا ہے۔ اخبار کا یہ ذخیرہ اسے وہب بن منبہ اور عبید بن شریہ کی فراہم کردہ معلومات سے حاصل ہوا تھا۔ تاریخ کے اس حصے کو چاہے اس کا کوئی بھی مرتبہ ہو، عربوں کی جدید تاریخ سے جوڑ کر ابن اسحٰق نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ کسی گروہِ انسانی کی تاریخ کو ٹکڑوں میں بانٹ کر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ اس کا مربوط مطالعہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز مقصد تک پہنچا سکتا ہے۔ اس طرح ساری دنیا کے انسانوں کی تاریخ ایک خاص سطح پر پہنچ کر ایک اکائی بن جاتی ہے۔

Marfat.com

تیسری خصوصیت جو ابن اسحق کے یہاں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کا خاکہ اس انداز سے مرتب کیا تھا جس کے اندر خلفاء راشدین اور بنی امیہ کی تاریخ بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ابن اسحاق سے پہلے بیشتر مولفین مغازی اپنی تالیفات میں محض سیرت و مغازی کے مضامین قلم بند کرتے تھے اور اسی پر کتاب ختم کر دیتے تھے لیکن ابن اسحاق نے اسی کتاب میں تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کو بھی شامل کر لیا۔ اس بات سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر مورخین کے اثرات سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ احداث و فتوح کے وقائع نگاروں مثلاً عوانہ اور ابو مخنف کے رجحانات سے بھی متاثر ہوا۔ ان کے نقش قدم پر چل کر ابن اسحق نے تاریخ ماقبل اسلام کو تاریخ اسلام سے جوڑ کر کوفی مدرسۂ فکر کی نمائندگی کی جو تاریخی واقعات کی صحت کو اسناد کے تسلسل ہی سے نہیں پرکھتا تھا بلکہ عقل و رائے کی کسوٹی پر اسے جانچتا بھی تھا۔ عراق کے ان علماء نے جاہلی اور اسلامی دور کی تاریخ سے گہری دلچسپی لی اور انھیں ایک دوسرے سے ملا کر تاریخی تسلسل قائم کیا۔ صدر اسلام کے واقعات کی تسوید میں مدنی علماء کے علمی ذخیرے کو اس نے نہ صرف یہ کہ اکٹھا کیا بلکہ اس کے اندر گراں قدر اضافہ بھی کیا۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ خلفاء راشدین اور بنی امیہ کی تاریخ پر وسیع معلومات کو مرتب کیا۔ یہ زبردست سرگرمی دوسری صدی کے نصف اول سے شروع ہوئی اور ان کی مدد سے تیسری صدی کے علماء تاریخ نے اپنی کتابوں کو مرتب کرنا شروع کیا۔

ابن اسحق نے علماء کوفہ کی پیروی میں صدر اسلام اور خلفاء راشدین

Marfat.com

کی تاریخ سے دلچسپی لے کر ان موضوعات پر تاریخی واقعات بھی قلم بند کیے۔ ظاہر ہے اس حصے میں واقعات کی ترتیب و تسوید کے لیے وقائع نگاری کا اصول اختیار کیا گیا چنانچہ ابن اسحق نے اس کی پابندی کی۔ اس کے ساتھ ہی مدنی اسکول کی نمائندگی بلکہ سرکردگی کا فخر بھی اسے حاصل تھا۔ اس اسکول کی خصوصیات جسے محدثین نے وضع اور منضبط کیا تھا۔ وہ ابن اسحق کے یہاں پوری طرح دیکھی جا سکتی ہیں یعنی ابن اسحق نے واقعات کے بیان میں اسناد کو برتنے کی پابندی کی ہے۔ کسی واقعہ کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے بیان کرنے والوں کا سلسلہ کیسا ہے۔ جو لوگ اس کو بیان کرتے ہیں وہ کس درجہ ثقاہت اور حیثیت کے مالک ہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن اسحق نے ان خصوصیات کو اپنے اندر سمو لیا تھا جو علٰحدہ علٰحدہ مدینہ اور عراق میں تاریخ نگاری کے فن میں اُبھرے اور ترقی کر سکے تھے۔ اس اعتبار سے ابن اسحق کو ان خصوصیات کا نمائندہ اور ان فکری رجحانات کا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ تاریخ نگاری جو سیرت و مغازی، فتوح و احداث اور تاریخ الرسل جیسے علیحدہ علیحدہ فنون پر مشتمل تھی ان سب کو یکجا کر کے ایک ساتھ پیش کرنے والوں میں ابن اسحق ہی تنہا وہ خوش قسمت مورخ ہے جس کی کتاب کا بڑا حصہ ہم تک پہنچ سکا ہے۔

ابن اسحق واقعات کی تلاش اور ان کے انتخاب میں تنقیدی بصیرت سے بھی کام لیتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی واقعہ کے بارے میں صرف ایک ہی سلسلۂ سند کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس موضوع پر اگر مختلف الطرق

Marfat.com

روایات ملتی ہیں تو ان سب کو ملا کر تمام اسناد کے ساتھ یکجا کر دیتا ہے اس طرح وہ ایک ہی واقعہ بن جاتا ہے۔ مثلاً غزوۂ احد کا واقعہ ابن اسحق کئی علماء کی سند سے بیان کرتا ہے۔ سند کے شروع میں بیان کر کے وہ تمام لوگوں کی روایات کو ملا کر ایک روایت کی شکل دے دیتا ہے لیکن اس سند میں بھی وہ چند ہی لوگوں کے نام دیتا ہے، سب کا ذکر بھی نہیں کرتا۔[۲۷۳] اسلوب بیان کا نمونہ جہاں ابن اسحق کے ذہنی اپج کی تصدیق کرتا ہے وہیں اس کی اس صلاحیت اور سلیقہ مندی کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے کہ ایک ہی واقعہ کے متعدد اور منتشر ٹکڑوں کو ملا کر کیسے ایک مکمل تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

اس دور میں علم نسب سے دلچسپی ایک قدرتی امر تھا بالخصوص ابن اسحق کے لیے۔ ابن اسحق کی یہ دلچسپی قدرتی طور پر سیرتِ نبوی سے دلچسپی کے ذریعے پیدا ہوئی۔ اس لیے اس نے قبائل عرب بالخصوص قریش کی متعدد شاخوں کے شجرۂ نسب معلوم کرنے کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کی معلومات بڑی وسیع تھیں۔ ابن العماد نے اس کو عالم انساب کہا ہے۔[۲۷۴] لیکن ابن ندیم اس کے ضعیف ہونے کا تذکرہ بھی کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ ابن اسحق نے اپنی کتاب میں انساب کی جو جدولیں تحریر کی ہیں وہ غلطی سے مبّرا نہیں ہیں۔[۲۷۵]

ابن اسحق کی ایک بڑی خامی یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اہل کتاب پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ ان سے معلومات حاصل کر کے اپنی کتاب میں جمع کرتا۔ یہ بات فی نفسہ میرے نزدیک عیب نہیں ہے۔ اس لیے کہ جن موضوعات پر اس نے اہل کتاب سے مدد حاصل کی ہے۔ اس کے بارے میں صرف اہلِ کتاب ہی تفصیل سے اور استناد کے ساتھ مواد فراہم کر سکتے تھے۔ خاص طور پر

Marfat.com

سیرالانبیاء اور اقوام قدیمہ کی تاریخ پر یہودی و عیسائی علماء ہی بہتر معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ اس لیے اس میدان میں اگر ابن اسحٰق نے یہودی اور عیسائی علماء کی طرف رجوع کیا تو یہ عیب نہیں بلکہ یہ تو عین علمی تقاضا تھا۔ رہا اس مواد کی صحت و عدم صحت کا مسئلہ تو اس کی زیادہ ذمہ داری ابن اسحٰق کے سر نہیں ہے۔

ابن اسحٰق نے سیرت و مغازی کے ادب کو ارتقاء کی ایک خاص منزل تک پہنچایا جس کی خصوصیات میں تلاش و تحقیق کے ساتھ اس فن کو نئے عناصر سے جوڑنا تھا اور اس کے دائرے میں سیرالانبیاء، تاریخ اقوام قدیمہ، انساب، صدرِ اسلام کی تاریخ، خلفاء راشدین و خلفاء بنی امیہ کے حالات شامل کر کے آنے والے مورخین کے لیے اس فن کو زیادہ آسان بنانا تھا۔ ابن اسحٰق نے بلاشبہ یہ خدمت انجام دی۔ اس کے بعد سیرت و مغازی کے موضوع پر دوسرے لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس ادب میں اضافے کیے ہیں۔ ان میں ابو معشر السندی، واقدی، محمد بن سعد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ابو معشر السندی سیرت و مغازی کا عالم گزرا ہے[۲۶]۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ اس نے سیرت کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی تھی[۲۷]۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی پوری زندگی کے حالات درج تھے۔ یہ کتاب اب نہیں ملتی۔ البتہ اس کے ٹکڑے واقدی اور محمد بن سعد کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان روایات کو دیکھنے سے ایک اہم خصوصیت فوراً سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اس نے اپنی کتاب میں سند کی پابندی نہیں کی ہے۔ اس کے بارے میں امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ وہ مغازی کے موضوع پر بصیرت

Marfat.com

رکھتا اور سچا تھا۔[۲۷۸] لیکن ذہبی کو اس کے قوتِ حافظہ پر بہت زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ ابنِ سعد کی رائے بھی کچھ اچھی نہیں[۲۷۹]۔ ان لوگوں نے غالباً اچھی رائے کا اظہار اس لیے نہیں کیا کہ ابو معشر احادیث کی روایت میں سند کی پابندی نہیں کرتا تھا۔ شاید یہ خامی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ اس کا حافظہ اعتماد کے قابل نہیں تھا۔ حدیث میں سند کی جانب سے غفلت تو خامی ہو سکتی ہے لیکن سیرت کی روایت میں سند کی بہرصورت پابندی ضروری نہیں ہے اسی لیے محمد بن سعد نے ابو معشر کو ضعیف سمجھتے ہوئے بھی اپنی کتاب میں اس کی معلومات سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کا تعلق صرف مغازی کی روایات سے ہے۔ اس کی احادیث کو لوگوں نے روایت کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

ابو معشر نے تاریخ اسلام کے موضوع سے بھی دلچسپی لی تھی اور اس فن پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ یہ کتاب ۱۷۰ھ تک کے حالات پر مشتمل تھی۔ لیکن افسوس اس کا وجود نہیں ہے البتہ اس کے ٹکڑے ابن جریر نے اپنی کتاب میں محفوظ کیے ہیں اور کئی واقعات کو اس کی کتاب سے نقل کیا ہے[۲۸۰]۔ اس کی تائید ابن ندیم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ابو معشر نے دوسری کتابوں کے علاوہ کتاب المغازی بھی تالیف کی تھی۔ یہ تاریخ ابو معشر کے سال انتقال سے کچھ ہی پیشتر تک کے حالات پر ختم ہوتی تھی۔ ابو معشر کی ایک سند کا ذکر ملتا ہے مگر اس کو ضعیف سمجھ کر لوگوں نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا[۲۸۱]۔

سیرت و مغازی کے مولفین کی اس جماعت میں ابو عبداللہ بن عمر الواقدی کا نام اونچے درجے کے سیرت نگار کی حیثیت سے ملتا ہے[۲۸۲]۔ اس

Marfat.com

کے علم وفضل کا بڑا چرچہ تھا اور اس نے سیرت و مغازی کے موضوع کے علاوہ احداث اسلامی اور فتوح پر کتابیں تالیف کی تھیں۔ خوش قسمتی سے اس کی کئی تالیفات ہم تک پہنچی ہیں جس سے اس کی دلچسپی میں تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ابراہیم کا کہنا ہے کہ واقدی صدر اسلام کی تاریخ واحداث کا سب سے بڑا عالم تھا مگر دورِ جاہلیت کی تاریخ پر اس کی نظر نہیں تھی۔[۲۸۳] مزید لکھتا ہے کہ اسلام کے بارے میں واقدی لوگوں کا امین ہے۔ ابن المبارک کا خیال ہے "میں مدینہ آیا جایا کرتا تھا ایک مرتبہ میں نے دریافت کیا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے، لوگوں نے واقدی کی طرف اشارہ کیا۔"[۲۸۴] واقدی کے ہر دلعزیز شاگرد محمد بن سعد نے اپنے استاذ کی یہ رائے نقل کی ہے جو ان کی اپنے بارے میں تھی۔ "کسی انسان نے اپنے حافظے کی مدد سے اتنا نہیں لکھا اور میرا حافظہ میری کتابوں سے کہیں زیادہ ہے۔"[۲۸۵] بلاشبہ واقدی کا حافظہ بہت قوی اور تیز تھا۔ اسی کی مدد سے اس نے معلومات کا وسیع خزانہ اپنے دماغ میں محفوظ کرلیا تھا۔ ان معلومات کو حاصل کرنے کے لیے واقدی نے بلادِ اسلامیہ کا علمی دورہ بھی کیا تھا چنانچہ بہت کم ایسے مراکز اور فوجی اہمیت کے مقامات رہے ہوں گے جنھیں واقدی نے دیکھا نہ ہو۔ وہ میدانِ جنگ میں پہنچ کر اس کے طول وعرض کو دیکھ کر فوجوں کی تعداد کا تعین کرتا تھا۔ ان معلومات کو تحریری شکل میں لانے کے لیے وہ اپنے پاس دو سکریٹری رکھتا تھا جو بقول ابن اسحق کے دن رات لکھا کرتے تھے۔[۲۸۶] یہ تحریریں غالباً کچھ تو وہ رہی ہوں گی جو مخطوطات سے نقل کی جاتی تھیں اور بعض واقدی کی اپنی تالیفات رہی ہوں گی جن کو وہ املا کراتا رہتا تھا۔

واقدی نے اپنی وسیع علمی سرگرمیوں کے نتیجے میں کتابوں کا بڑا سرمایہ اکٹھا کیا تھا۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ واقدی نے کتابوں کے چھ سو بستے اپنے پیچھے چھوڑے تھے[۲۸۷]۔ اس کی کتابیں جو فن سیرت ومغازی، طبقات اور تاریخی واقعات سے متعلق تھیں، ان کی بڑی شہرت ہوئی اور وہ بلادِ اسلامیہ کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ واقدی کی شہرت، ثقاہت اور مقبولیت میں کتنی زیادہ اور مسلّم تھی۔ اس کا ایک قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اس دور میں اسلامی علوم وفنون اور بالخصوص تاریخ سے لوگ کس درجہ دلچسپی لیتے تھے اور عوام میں مورخین کا کیا مقام تھا۔

فن مغازی پر واقدی کی کتاب غالباً خاصی طویل تھی اور اس میں تاریخ اسلامی کے دوسرے ادوار کے بارے میں بھی مواد پایا جاتا تھا۔ کیونکہ ابن ندیم نے اس کا نام کتاب التاریخ والمغازی تحریر کیا ہے[۲۸۸]۔ یہ واقدی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی کتاب المغازی مکمل طور پر موجود ہے اس کا ایک حصہ وان کریمر نے دمشق سے حاصل کرکے ایڈٹ کیا تھا جو کلکتے سے ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا ایک مکمل اور دوسرا ناقص نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[۲۸۹]۔

واقدی کی اس مطبوعہ کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا رجحان فقہی تھا کیونکہ جو مطبوعہ مواد ہمارے پاس ہے اس میں ایسے واقعات کثرت سے ملتے ہیں جو فقہی خیالات کے حامل ہیں۔ اس میں خالص تاریخی عنصر کی کمی پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب عبداللہ بن حیۃ سے مروی ہے جو انھوں نے محمد بن شجاع ثلجی سے روایت کی تھی اور محمد نے واقدی سے۔ ڈاکٹر جواد علی نے نولدیکے کی رائے سے اتفاق کرتے

ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ مطبوعہ مواد غالباً اصل کتاب کا تکملہ ہے جسے بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اضافہ کرنے والے واقدی کے رواۃ اور شارحین ہوسکتے ہیں۔ اس لیے وان کریمر کے نسخے کو مکمل سمجھنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا مکمل اور صحیح نسخہ مرتب کرنے کی واقعی ضرورت ہے اور یہ کام اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر ان کا تقابلی، علمی اور تحقیقی مطالعہ کیا جائے۔

واقدی نے اپنی کتاب کا مواد غالباً مدینے ہی میں اکٹھا کیا تھا۔ اس نے یہ مواد ان اساتذہ کے ذریعے فراہم کیا تھا جو مدینے کے باشندے تھے یا جنھوں نے باہر سے آکر مدینے میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس طرح مدنی مکتب فکر سے متاثر ہوئے۔ یہی مخصوص صورت حال تھی جس سے واقدی متاثر ہوئے اور بالآخر اس کے نمائندے بن گئے۔ اور ان علمی روایات کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا جس کو مدینے کے علماء و شیوخ نے پروان چڑھایا تھا۔ واقدی کی کتاب میں ایسا مواد زیادہ ملتا ہے جو آنحضرتؐ کی مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ واقدی نے مسودات، احکام و فیصلوں کے ریکارڈ اور متعدد دستاویزوں کو بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ یہ سب اس نے اپنے پیش رو علماء سے حاصل کیا تھا۔ واقدی نے واقعات کو قلم بند کرنے کا ایک خاص طریقہ بھی اختیار کیا تھا جو کسی اور مؤلف کے یہاں نہیں ملتا مثلاً سب سے پہلے وہ فوجوں کی روانگی اور واپسی کی تاریخیں ترتیب کے ساتھ فراہم کرتا ہے۔[290] اس کے بعد پورا واقعہ از سر نو بیان کرتا ہے[291]۔ اس انداز بیان کی خوبی یہ ہے کہ واقعہ کی پوری تصویر شروع ہی میں سامنے آجاتی ہے۔ اس سے

Marfat.com

علاوہ واقدی نے اپنی کتاب میں آیاتِ قرآنی سے بھی استشہاد کیا ہے ایسی آیات جن کا تعلق کسی واقعہ سے ہو، انھیں وہ موقع بہ موقع نقل کرتا جاتا ہے[۲۹۲]۔

واقدی نے ان حکام کی فہرست بھی فراہم کی ہے جو وقتاً فوقتاً آنحضرتؐ کی عدم موجودگی میں مدینے کا انتظام سنبھال لیتے تھے[۲۹۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نگاری کا فن اپنے دامن کو وسیع کرتا جا رہا تھا اور مغازی کے مؤلفین جو اس فن کو حدیث سے علیحدہ نہ کر سکے تھے مگر دونوں میں امتیاز پیدا ہو چلا تھا وہ اب مکمل طور پر علیحدہ اور تاریخی خصوصیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ واقدی سے پہلے ہی یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ واقدی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے یہاں اشعار نقل کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ حالانکہ وہ ابن اسحاق کی طرح اگر ایسا کرتا تو شاید اپنے معاصرین کی تنقید سے کچھ زیادہ واسطہ نہ پڑتا۔ اس اجتناب کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ تاریخ کا علمی تصور اس کے یہاں اور زیادہ واضح ہو گیا تھا۔

مدنی مکتب فکر کی ایک نمایاں خصوصیت سند کی پابندی تھی۔ چنانچہ یہ پابندی واقدی کے یہاں خاص اہمیت اختیار کر گئی۔ کیونکہ اور لوگوں نے کبھی کبھی اس کی طرف سے غفلت بھی برتی ہے لیکن واقدی نے اس کی بڑی سختی سے پابندی کی ہے۔ واقعات کو پرکھنے کا ایک مناسب طریقہ یہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ واقدی نے مغازی کی ایک اور پرانی خصوصیت کو ترک کر دیا۔ یہ قصہ اور غیر عقلی واقعات کا عنصر تھا۔ واقدی نے اس کو ترک کر کے اپنے تحقیقی اندازِ فکر کا اظہار کیا۔ واقدی واقعات

Marfat.com

کی تحقیق و تلاش میں بڑی محنت اور ایمانداری سے کام لیتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کا یہ قول اس کی توثیق کرتا ہے۔" میں نے کسی بھی صحابی کے ہر لڑکے اور اس کے آزاد کردہ ہر غلام سے براہ راست مل کر پوچھ تاچھ کی ہے۔ اسی طرح تابعین کے کسی لڑکے کو بھی ایسا نہیں چھوڑا جس سے دریافت نہ کیا ہو۔ میں پوچھتا تھا کہ کیا تم نے سنا ہے کہ تمھارے گھر والوں میں سے کوئی بھی کسی جنگ میں شریک ہوا ہے اور اس نے شہادت پائی ہے۔ جب اس نے بتایا تو میں نے موضع جنگ کا معائنہ کیا۔ میں نے مرلیسع اور دیگر ان میدانوں کا معائنہ کیا جہاں جنگ ہوئی تھی۔" ابن منیع نے ہارون القروی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے " میں نے مکہ میں واقدی کو دیکھا تو اس سے پوچھا۔ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا حنین جا رہا ہوں تاکہ اس کا معائنہ کروں جہاں جنگ ہوئی تھی۔[۲۹۴] واقدی کے بارے میں اس طرح کی روایات اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ وہ واقعات کی چھان بین کے لیے کتنا حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتا تھا اور اس کا تاریخی ذوق کس قدر علمی تھا۔ اس کے باوجود ابن ندیم نے اس کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ تشیع کی جانب میلان رکھتا تھا لیکن تاریخ اسلام پر نظر ڈالنے سے اس بات کی کوئی بہت زیادہ اہمیت نہیں رہ جاتی کیونکہ معاصرانہ چشمک میں علماء ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرتے رہتے تھے۔ واقدی کی احادیث کو ضعیف سمجھا جاتا تھا۔[۲۹۵] یہ رائے تمام مولفینِ مغازی کے بارے میں یکساں درجہ رکھتی ہے۔

واقدی کی دلچسپیوں کا دائرہ صرف مغازی و سیرت تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے تاریخ اسلام کے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور

Marfat.com

کئی کتابیں صدر اسلام کے تاریخی واقعات پر تحریر کی ہیں۔ مثلاً ارتداد، مقتل عثمان، صفین، جمل، فتح عراق و شام جیسے موضوعات پر کتابچے لکھے ہیں۔ ابن خلکان نے اس کی ایک کتاب "کتاب الردۃ" کا ذکر کیا ہے۔ اس میں وفات نبوی کے بعد طلیحہ بن خویلد، اسود العنسی اور مسیلمۃ الکذاب کے دعویٔ پیمبری اور ارتداد کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔[۲۹۶] ابن ندیم نے واقدی کی ان ۲۸ کتابوں اور رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جو تاریخ اسلام کے متعدد پہلوؤں سے متعلق تھے۔[۲۹۷] ان میں سے ایک نہایت اہم کتاب "کتاب التاریخ الکبیر" تھی۔ اس کتاب میں کم از کم سنہ ۱۷۹ھ تک کے واقعات درج ہیں۔[۲۹۸] یہ کتاب اب موجود نہیں ہے لیکن اس کے کئی ٹکڑے طبری نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔[۲۹۹] ان واقعات کو واقدی نے بڑی دیدہ ریزی سے حاصل کیا تھا اور ان کے اندر صداقت سے کام لینے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ اس کی ایک اہم کتاب "کتاب الطبقات" تھی جو سیرت نبوی، صحابہ اور تابعین کی تاریخ پر مشتمل تھی۔ اسی کتاب کو ابن سعد نے اپنے لیے نمونہ قرار دیا تھا بلکہ اس کا بڑا حصہ اپنی کتاب "کتاب الطبقات" میں محفوظ بھی کر دیا ہے۔ واقدی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ الفقہا نامی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔

واقدی کی کتابیں بالخصوص مفتوح الشام اور فتوح العراق وغیرہ چھپ چکی ہیں لیکن ان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقدی کی عالمانہ اور تحقیقی روح ان کتابوں میں باقی نہیں رہی۔ اس لیے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کے کسی شاگرد یا بعد کے کسی عالم نے ان کتابوں کو مرتب کر کے واقدی کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ اور ترتیب کے وقت واقدی

کی کتابیں بھی اس کے پیشِ نظر رہی ہوں۔ واقدی نے اپنی تاریخی کتابوں کے ذریعہ صدرِ اسلام کے بیشتر واقعات کو اپنی کتابوں میں محفوظ کرکے عرب تاریخ نگاری کے فنی پہلوؤں کو اور نمایاں کیا ہے۔

واقدی کا ایک ہر دلعزیز شاگرد محمد بن سعد بھی ہے[300]۔ اس نے مغازی و تاریخ اسلام پر کئی کتابیں تالیف کرکے اس ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ابن سعد عرصۂ دراز تک واقدی کے ساتھ رہا اور سکریٹری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ اس طرح اس کو وسیع مطالعے کا موقع ملا اور واقدی کی فراہم کردہ معلومات سے مستفید ہونے کی صورت نکلی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ابن سعد نے صحابہ، تابعین اور خلفا پر اپنے دور کے طبقات کی ضخیم کتاب تحریر کی تھی[301]۔ اس کو وہ بہترین اور مفید بتاتا ہے کیونکہ اس کتاب کو اس نے پڑھا تھا۔ اس کی ضخامت پندرہ جلدوں پر مشتمل تھی۔ غالباً یہی کتاب ہے جو ہمارے سامنے موجود ہے۔ طبقات پر اس کی ایک اور کتاب تھی ممکن ہے یہ دوسری کتاب واقدی کی رہی ہو جس کو اس نے مرتب کیا ہو۔

ابن سعد نے سیرتِ نبوی پر بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ ابن ندیم نے اس کا نام "کتاب اخبار النبی" تجویز کیا ہے[302]۔ اس کتاب کے بارے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اس کا طرزِ تحریر اور انداز کیسا تھا۔ کیونکہ یہ کتاب موجود نہیں ہے اور نہ ہی سیرت و تاریخ کی دیگر کتابوں میں اس کے ٹکڑے موجود ہیں۔ لیکن اتنی بات تو ظاہر ہے کہ اس نے کتاب مرتب کرتے وقت سیرت کی دوسری کتابوں کو پیشِ نظر رکھا ہوگا جو مدنی مکتبِ فکر کی نمائندہ تھیں۔

Marfat.com

حوالہ جات:

۱۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۳۲۔

۲۔ ابن اسحق کی "سیرت ابن اسحق" ایک اخباری اطلاع کے مطابق مل گئی ہے۔ مراکش حکومت کی فرمائش پر ڈاکٹر حمید اللہ ایڈٹ کر رہے ہیں۔ محمود الحسن۔

۳۔ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۵۔ ص ۸۸۔ ۸۹۔ یاقوت الحموی۔ معجم الادبا۔ ج ۱۹ ص ۲۵۹۔

۴۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۳۸۔ مسعودی نے وہب کی کتاب کو استعمال کیا تھا۔ مسعودی "مروج الذہب" ج ۱۔ ص ۵۳

۵۔ Ency of Islam Vol 4. P. 63

۶۔ ابو یوسف۔ کتاب الخراج۔ ص ۲۴۔

۷۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست۔ ص ۱۳۱۔

۸۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست۔ ص ۱۴۱۔ خیر الدین الزرکلی۔ الاعلام۔ ج ۳۔ ص ۹۰-۹۴

۹۔ حسین نصار۔ نشأۃ التدوین التاریخی عند العرب۔ ص ۱۳۔

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن عباس ہجرت مدینہ سے تین سال پہلے مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ان کا انتقال مدینے میں ۶۸ھ میں ہوا۔

۱۱۔ ابن سعد۔ طبقات ابن سعد۔ ج ۲۔ ص ۱۷۲

۱۲۔ " " " "

۱۳۔ ذکر الواقدی باسناد له قال وجدت هذا الكتاب فی كتب ابن عباس بعد موته فنسخته فاذا فيه الى آخره۔

اس عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن عباس کی کتابیں تیسری صدی تک موجود تھیں جن کو واقدی نے استعمال کیا تھا۔ ابن سید الناس، عیون الاثر۔ ج ۱۔ ص ۲۶۷۔

۱۴۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست۔ ص ۱۳۲

۱۵۔ " " " "

۱۶۔ اخبار عبید۔ ص ۳۱۹

۱۷- اخبار عبید - ص ۴۰۵

۱۸- " ص ۳۹۵

۱۹- " ص ۳۹۲

۲۰- " ص ۳۶۷

۲۱- " ص ۳۶۷

۲۲- یہ جملے کتاب میں ملتے ہیں۔" وذکر محمد بن اسحق فی غیر حدیث عبید بن شریۃ"
اخبار عبید- ص ۳۷۸

وفی حدیث وھب بن منبہ، اخبار عبید- ص ۳۷۹

۲۳- F. Krenkov. The two oldest books of arobic folk lore Islamic culure, Hydrabad, 1928, I, 11-

۲۴- Horovitz. The earliost biographies of the prophit and their authors. Islamic culture, Hydrabad, 1972, P. 535.

۲۵- ابان خلیفۂ ثالث حضرت عثمان کے صاحبزادے تھے۔ ان کی ولادت غالباً ۲۰ھ سے پہلے ہو چکی تھی۔ کیونکہ ۳۶ھ میں ان کی عمر اتنی ہو گئی تھی کہ اپنے والد کی شہادت کے سلسلے میں ہونے والی جنگوں میں حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے ساتھ شریک ہوں۔ اس کے بعد عرصے تک جس کی مدت چالیس برس بتائی جاتی ہے۔ وہ غالباً گوشہ نشین اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ شعر و ادب سے انھیں دلچسپی تھی۔ مگر حدیث و مغازی سے زیادہ شغف تھا۔ ۷۵ھ میں خلیفہ عبد الملک نے انھیں مدینے کا گورنر مقرر کیا اور اس عہدے پر وہ ۸۳ھ تک کام کرتے رہے۔ ابان کو جب گورنر مقرر کیا گیا اور وہ مدینے واپس آئے تو ان کے خاندان والوں نے بڑا جشن منایا۔ ایک شاعر طاوس نے ڈھول پر طربیہ اشعار گا کر ابان کو محظوظ کیا۔ انھیں ۸۳ھ میں گورنری سے معزول کر دیا گیا۔ اس دوران انھوں نے مدینے کے بعض ممتاز حضرات کے نماز جنازہ کی امامت بھی کی۔ مثلاً جابر بن عبداللہ، محمد بن الحنفیۃ اور عبداللہ بن جعفر کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی امارت کے دوران انھوں نے ایک قاضی مقرر کیا۔ جعلی سکے بنانے

والوں کو سزا دی اور اہل مدینہ کے صاع میں اضافہ کیا۔ ابان کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ غالباً ۹۵ھ یا پھر ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

ابن سعد۔ طبقات ابن سعد، ج ۵۔ ص ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ اصفہانی، کتاب الاغانی۔ ج ۴۔ ص ۲۱۹۔ ۲۲۰۔

Horovitz. The earliest biographies of the prophet and their authors. Islamic culture, Hydrabad. Vol. I - P. 536-37.

۲۶۔ کان ثقۃ قلیل الحدیث الا مغازی رسول اللہ اخذھا من ابان بن عثمان فکان کثیرا ما تقرأ علیہ ویأمرنا بتعالیمہ۔ ابن سعد۔ طبقات ابن سعد۔ ج ۵۔ ص ۱۵۶۔

۲۷۔ یعقوبی۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۱۔ ص ۳۔

۲۸۔ عروۃ بن الزبیر مشہور صحابی زبیر بن العوام کے فرزند تھے۔ ان کے سنہ پیدائش کئی تاریخی کتابوں میں مذکور ہیں۔ یعنی ۲۲ھ، ۲۳ھ، ۲۶ھ، اور ۲۹ھ وغیرہ۔ ان کی ماں اسماء بنت ابی بکر تھیں۔ نانی صفیہ بنت عبدالمطلب، خالہ حضرت عائشہ اور ان کی پھوپی خدیجہ بنت خویلد تھیں۔ عروۃ کے دادا حضرت خدیجہ کے بھائی تھے۔ ان کے بھائی عبداللہ نے یزید کی بیعت سے انکار کرکے ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک مکہ میں حکومت کی۔ اس طرح ان کا گھرانہ جاہلی اور اسلامی دونوں ادوار میں طبقۂ امراء میں شمار ہوتا تھا، اس لیے ان کی پرورش بھی بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ بچپن ہی سے انھیں تعلیم سے دلچسپی تھی اور انھوں نے حدیث و مغازی جیسے موضوعات سے دلی لگاؤ پیدا کر لیا تھا جو آگے چل کر پختگی کی حد تک پہنچ گیا۔ شعر و ادب میں بھی درک رکھتے تھے۔ فن انساب پر وسیع نظر پیدا کر لی تھی۔ انھوں نے یہ سارے علوم اپنے دور کے مشہور اہل علم سے حاصل کیے تھے۔ ان لوگوں میں خود ان کی والدہ، زید بن ثابت، اسامہ بن یزید، ابو ہریرۃ، امیر معاویہ، عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہ، حضرت علی اور عبداللہ بن زید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خلیفہ عبدالملک سے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ وہ ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔

Marfat.com

خلیفہ ان کا احترام کرتا تھا۔ جب ولید ۸۶ھ میں خلیفہ ہوا تو عروہ دمشق گئے اور اس سفر میں ان کا ایک بیٹا محمد جو شاہی اصطبل کی چھت سے گر پڑا اسے گھوڑے نے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے علاوہ خود ان کی اپنی ایک ٹانگ بھی زخم کی وجہ سے کاٹ دی گئی تھی۔

وہ زیادہ تر مدینے میں رہتے تھے لیکن اکثر علمی اور تعلیمی مقاصد کے پیش نظر دوسرے شہروں کا سفر بھی کرتے تھے۔ ان کا مدینے سے عرصے تک دور رہنے کا زمانہ ۵۸ھ سے ۶۵ھ تک کا ہے جب وہ مصر چلے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انھوں نے ایک شادی بھی کی تھی۔ کئی بار انھوں نے دمشق کا سفر کیا۔ ان کے سال وفات کے بارے میں قطعی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مورخین نے متعدد تاریخیں نقل کی ہیں البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے ۹۲ھ اور ۹۵ھ کے درمیان کسی سال ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کے آٹھ بیٹوں کے نام ہمیں کتابوں میں ملتے ہیں۔ عروہ کو فضائل اخلاق اور تحصیل علم کے سوا کسی اور چیز کی تمنا نہیں تھی چنانچہ دونوں کو حاصل کرکے رہے۔ ان کے چشمۂ فیض سے جو تشنگانِ علم سیراب ہوئے ان میں زہری اور ابن اسحق کے نام سرفہرست ہیں۔

ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۴۰۔ ۴۸۔ ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء ج ۳۔ ص ۸۔ ذہبی تذکرہ الحفاظ۔ ج ۱۔ ص ۶۲۔ ابونعیم۔ حلیۃ الاولیاء ج ۲۔ ص ۱۷۸۔ ابن الجوزی۔ صفۃ الصفوۃ ج ۲۔ ص ۴۷۔ ۴۹۔ عسقلانی۔ تہذیب الاسماء، ج ۱، ص ۳۳۱۔ طبری۔ تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۲۔ ص ۱۱۸۔ اصفہانی۔ کتاب الاغانی ج ۱۔ ص ۱۱۔

۲۹۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۴۰۔ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۲۔ ص ۴۲۱۔

۳۰۔ بلاذری۔ انساب الاشراف۔ ج ۵۔ ص ۳۷۰۔

۳۱۔ اصفہانی۔ کتاب الاغانی۔ ج ۹۔ ص ۳۱۳۔

۳۲۔ ابن سعد، طبقات۔ ج ۵۔ ص ۱۳۵۔

۳۳۔ حاجی خلیفہ۔ کشف الظنون۔ ج ۲۔ ص ۱۷۴۷۔ سخاوی۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ۔ ص ۱۵۹۔

۳۴۔ ابن ہشام۔ سیرت ابن ہشام۔ ج اول۔ ص ۲۲۵، ۲۳۴، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۸۹، ۳۱۴، ۳۱۸، ۳۷۲،

۳۵۔ طبری۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲۔ ص ۲۹۸، ۳۲۸، ۳۶۶، ۳۷۵، ۳۸۱، ۴۰۰، ۴۱۱، ۴۲۱، ۴۲۴، ۴۵۶۔

۳۶۔ ابن سید الناس، عیون الاثر ج ۱۔ ص ۹۰، ۲۶۹۔

۳۷۔ ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲۔ ص ۱۱۸۰، ۱۱۸۴، ۱۶۳۴۔

۳۸۔ "انہ کتب الی عبد الملک بن مروان۔ امابعد فانہ لما دعا قومہ لما بعثہ اللہ من الھدیٰ والنور الذی انزل علیہ" اس میں سند کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ ابن جریر۔ تاریخ الرسل ج ۲۔ ص ۳۲۸۔

۳۹۔ ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲۔ ص ۱۱۴۷، ۱۱۵۴، ۱۲۳۷، ۱۲۴۲۔

۴۰۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں: "اذا نظرت فی کتابی ھذا فسیر حتی تنزل نخلۃ بین مکۃ والطائف فترصد بہا قریشاً و تعلم لنا من اخبارھم" ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲۔ ص ۴۱۲، ۴۱۳۔ مصری ایڈیشن۔

۴۱۔ ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۳۔ ص ۳۹۱، ۵۰۵۔

۴۲۔ " " " " ۔ ص ۵۲۵

۴۳۔ بلاذری۔ فتوح البلدان۔ ص ۱۲۲۔

۴۴۔ ابن جریر۔ تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۳۔ ص ۲۷۹

۴۵۔ " " " " ۔ ص ۴۱۹۔ ۴۲۰۔

۴۶۔ قریش کی ایک مشہور شاخ زہرہ بن کلاب ہے۔ محمد بن مسلم اسی قبیلے سے تھے۔ اسی لیے زہری کہلائے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آنحضرتؐ کی والدہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ زہری کے سنہ ولادت میں کئی روایتیں ملتی ہیں۔ مزی کے ہم خیال ۵۰ھ کو مانتے ہیں۔ خلیفہ ۵۱ھ۔ ابن کبیر ۵۶ھ۔ اور واقدی ۵۸ھ کو ان کا سالِ ولادت قرار دیتے ہیں۔ مگر عام طور پہ مزی کی رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ زہری کے دادا نے غزوہ بدر میں کفار مکہ کا ساتھ دیا تھا اور جنگِ احد میں ان کے ہاتھوں آنحضرتؐ کو شدید زخم پہنچا تھا۔ ان کے باپ مصعب بن زبیر کے ساتھیوں میں تھے۔ اسی مناسبت

Marfat.com

سے انھوں نے آلِ مصعب سے اپنی دوستی کو باقی رکھا۔ علمی استفادہ کے علاوہ بھی عروۃ بن زبیر سے ان کے مراسم میں اس خاندانی تعلق کا اثر ملتا ہے۔ زہری کے ایام طفولت مدینے میں گزرے اور یہیں انھوں نے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ حدیث، شعر و ادب اور سیرت و مغازی سے ان کو طبعی مناسبت تھی۔ چنانچہ انھوں نے تمام ائمۂ کبار سے استفادہ کیا مثلاً سعید بن المسیب، ابان بن عثمان، عروۃ بن الزبیر، علقمہ بن وقاص، علی بن الحسین، ابن عمر، سہل بن سعد، اور مالک ابن انس وغیرہ سے کسب فیض کیا۔ زہری نے کئی صحابہ سے ملاقات اور ان سے علمی استفادہ کیا جن کی بنا پر وہ تابعی بھی تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے وہ دور دراز کا سفر کرتے تھے۔ ان کے اس مشغلے کو باقی رکھنے اور اس میں گہرائی پیدا کرنے میں خلفاء بنی امیہ کی نوازشوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ زہری کے تعلقات خلفاء سے بہت خوشگوار تھے۔ عبداللہ بن مروان ہشام بن عبدالملک اور یزید بن عبدالملک ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ موخر الذکر نے انھیں منصب قضاء پر مامور کیا۔ ہشام گرانقدر رقوم سے مدد کرتا رہتا تھا۔ ایک بار سات ہزار دینار کی رقم خطیر قرضے کی ادائیگی کے لیے عنایت کی۔ وہ عرصے تک ہشام کے پاس مقیم رہے کیونکہ اس کے بچے کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد تھی۔ آخر کار انھوں نے دمشق میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ زہری کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ساتھ ہی سرکاری طور پر اطرافِ سلطنت میں زہری کے علم کا اشتہار کرا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں انسان ان کی طرف مائل ہوتے تھے۔ زہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا۔ فلسطین سے ملتی ہوئی حجاز کی سرحد پر اپنی زمین میں دفن کر دیے گئے۔ ان کے شاگردوں میں مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، سفیان الثوری، محمد بن اسحق اور لیث بن سعد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ذہبی۔ تراجم الرجال ص ۸۷۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۱۔ ص ۱۱۲۔ ابن قتیبۃ۔ کتاب المعارف، ص ۱۶۲۔۱۶۳۔ بخاری۔ تاریخ الکبیر، ج ۱۔ ص ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ابونعیم۔ حلیۃ الاولیاء ج ۳۔ ص ۳۶۰۔ اصفہانی۔ کتاب الاغانی۔ ج ۱۹۔ ص ۵۹۔
Ency of Islam Vol 4, P. 1236 - 1241 -

۴۷۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۱۱۳۔

۴۸۔ ابن الجوزی۔ صفۃ الصفوۃ ج ۲۔ ص ۷۷۔

۴۹۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۶۹۔

۵۰۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۱۱۳۔

۵۱۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۶۶۔

۵۲۔ ابن سعد۔ طبقات ابن سعد ج ۲۔ ص ۳۸۹۔

۵۳۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۶۷۔

۵۴۔ ابن الجوزی۔ صفۃ الصفوۃ۔ ج ۲۔ ص ۷۸۔

۵۵۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال ج ۳۔ ص ۱۲۶۔

۵۶۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۷۱۔

۵۷۔ 〃 〃 ص ۶۹۔

۵۸۔ بخاری۔ تاریخ الکبیر ج ۱۔ ص ۲۱۔

۵۹۔ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۳۔ ص ۳۱۷۔

۶۰۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۱۰۸۔

۶۱۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۷۱۔ ۷۲۔

۶۲۔ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ص ۱۰۸۔

۶۳۔ ذہبی۔ تراجم الرجال۔ ص ۶۹۔

۶۴۔ 〃 〃 ص ۷۰۔

۶۵۔ ابو نعیم۔ حلیۃ الاولیاء ج ۳۔ ص ۳۶۰۔ ۳۶۱۔

۶۶۔ ابن ہشام۔ سیرۃ ابن ہشام۔ ج ۱۔ ص ۷۔

۶۷۔ 〃 〃 ص ۶۹۔

۶۸۔ 〃 〃 ص ۲۰۷۔

۶۹۔ 〃 〃 ص ۳۱۵۔ ۳۱۶۔

Marfat.com

۷۰- ابن ہشام- سیرۃ ابن ہشام ج ۱ - ص ۳۳۸ - ۳۳۹-

۷۱- " " " ص ۳۳۹ - ۳۴۰-

۷۲- " " " ص ۳۷۳ - ۳۷۴-

۷۳- " " " ص ۴۰۰-

۷۴- " " " ص ۴۳۴-

۷۵- " " " ص ۴۸۹ - ۴۹۰-

۷۶- " " " ص ۵۶۳ - ۵۶۴-

۷۷- " " " ص ۵۸۶ - ۵۸۸-

۷۸- " " ج ۲ ص ۶۰-

۷۹- " " " ص ۲۱۴-

۸۰- " " " ص ۲۲۳-

۸۱- " " " ص ۲۳۳-

۸۲- " " " ص ۲۷۳ - ۲۷۶-

۸۳- " " " ص ۲۹۷-

۸۴- " " " ص ۳۰۹-

۸۵- " " " ص ۳۰۸ - ۳۲۴-

۸۶- " " " ص ۳۲۷-

۸۷- " " " ص ۳۴۰-

۸۸- " " " ص ۳۵۶-

۸۹- " " " ص ۴۱۸-

۹۰- " " " ص ۴۴۲-

۹۱- " " " ص ۵۳۱-

۹۲- " " " ص ۴۶۹-

Marfat.com

۹۳۔ ابن ہشام۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۶۴۲۔

۹۴۔ 〃 〃 〃 ص ۶۵۰۔

۹۵۔ 〃 〃 〃 ص ۶۵۲۔

۹۶۔ 〃 〃 〃 ص ۶۶۰۔

۹۷۔ ابن جریر طبری۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲۔ ص ۱۱۲۹۔

۹۸۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۵۱۔ قاہرہ اڈیشن۔

۹۹۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ ج ۲۔ ص ۱۷۲۔

۱۰۰۔ ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۲۔ ص ۱۳۶۰۔

۱۰۱۔ 〃 〃 〃 ج ۳۔ ص ۱۷۸۸۔

۱۰۲۔ 〃 〃 〃 ج ۱۔ ص ۱۱۴۔

۱۰۳۔ 〃 〃 〃 ج ۱۔ ص ۱۰۰۔

۱۰۴۔ 〃 〃 〃 ج ۱۔ ص ۲۷۰۔

۱۰۵۔ 〃 〃 〃 ج ۱۔ ص ۲۹۱۔

۱۰۶۔ 〃 〃 〃 ج ۲۔ ص ۱۰۱۲، ۱۰۱۴۔

۱۰۷۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔

۱۰۸۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۲۹۔

۱۰۹۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۴۵، ۱۱۴۶۔

۱۱۰۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۴۷۔

۱۱۱۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۵۵۔

۱۱۲۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۶۷۔

۱۱۳۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲۰۵۔

۱۱۴۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۳۔

۱۱۵۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲۶۰۔

۱۱۶ - ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۲ - ص ۱۲۷۳

۱۱۷- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲۹۲-۱۳۲۲-

۱۱۸- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۳۶۰-

۱۱۹- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۳۷۸-

۱۲۰- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۳۸۴-

۱۲۱- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۵۱-

۱۲۲- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۶۳-۱۴۷۳-

۱۲۳- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۴۸۵-

۱۲۴- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۱۷-۱۵۱۸-

۱۲۵- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۲۹-۱۵۳۰-۱۵۳۳-
۱۵۳۴-۱۵۳۶-۱۵۳۸-
۱۵۴۵-۱۵۴۹-۱۵۵۰-
۱۵۵۱-

۱۲۶- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۶۰-

۱۲۷- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۶۵-

۱۲۸- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۸۵-

۱۲۹- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۵۹۰-

۱۳۰- 〃 〃 〃 ج ۳ - ص ۱۶۹۲-

۱۳۱- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷۳۹-

۱۳۲- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷۸۳-

۱۳۳- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۷۸۸-

۱۳۴- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۸۰۰-

۱۳۵- 〃 〃 〃 〃 ص ۱۸۰۲-

۱۳۶ - ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۳ - ص ۱۸۰۷، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۲، ۱۸۱۴، ۱۸۱۴
۱۸۱۵ -

۱۳۷ - ابن سید الناس - عیون الاثر ج ۱ - ص ۱۲۶ - ۱۲۸ -

۱۳۸ - " " " ص ۱۳۱ - ۱۳۲

۱۳۹ - " " " ص ۲۲۲

۱۴۰ - " " ج ۲ - ص ۴۰

۱۴۱ - " " " ص ۲۲۲

۱۴۲ - ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۲ - ص ۱۵۶۰

۱۴۳ - " " " ص ۱۳۶۰ - سیرۃ ابن ہشام ج ۲ -
ص ۳۲۲ - ۳۲۷ -

۱۴۴ - اصفہانی - کتاب الاغانی ج ۴ - ص ۲۴۸ -

۱۴۵ - ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۳ - ص ۱۸۲۰ - ۱۸۲۴ -

۱۴۶ - " " " ص ۱۸۲۵ -

۱۴۷ - " " " ص ۱۸۲۸ -

۱۴۸ - " " " ص ۱۸۶۹ -

۱۴۹ - " " ج ۴ - ص ۲۱۲۸ - ۲۱۳۱

۱۵۰ - " " " ص ۲۱۴۲

۱۵۱ - " " ج ۵ - ص ۲۵۱۲ - ۲۵۱۳

۱۵۲ - " " ج ۵ - ص ۲۵۳۹

۱۵۳ - " " " ص ۲۷۲۷

۱۵۴ - " " " ص ۲۷۳۱

۱۵۵ - " " " ص ۲۷۵۲

۱۵۶ - " " " ص ۲۷۵۷

Marfat.com

۱۵۷۔ ابن جریر الطبری ۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۵۔ ص ۲۷۹۸

۱۵۸۔ " " " ص ۲۸۷۰

۱۵۹۔ " " ج ۶ ۔ ص ۳۰۵۲

۱۶۰۔ " " " ص ۳۰۵۴

۱۶۱۔ " " " ص ۳۰۶۹ ۔ ۳۰۷۰

۱۶۲۔ " " " ص ۳۱۰۲ ۔ ۳۱۲۴ ۔ ۳۱۸۴ ۔

۱۶۳۔ " " ج ۵ ۔ مصری اڈیشن ۔ ص ۲۲۹ ۔

۱۶۴۔ " " " " ص ۲۳۱ ۔

۱۶۵۔ " " ج ۶ ۔ " ص ۳۶

۱۶۶۔ " " " " ص ۵۳

۱۶۷۔ " " ج ۷ یورپین اڈیشن ۔ ص ۵

۱۶۸۔ " " " " ص ۷

۱۶۹۔ " " ج ۸ ص ۱۴۵۲

۱۷۰۔ " " ج ۷ ص ۱۹۹

۱۷۱۔ " " " ص ۳۹۷

۱۷۲۔ " " ج ۸ ص ۱۲۶۹

۱۷۳۔ "ان الزہری کتب لجدہ اسنان الخلفاء فکان فیما کتب من ذالک" تاریخ الرسل والملوک ج ۷ ۔ ص ۴۲۸

۱۷۴۔ اصفہانی ۔ کتب الاغانی ج ۱۹ ۔ ص ۵۹

۱۷۵۔ ذہبی ۔ تراجم الرجال ۔ ص ۶۸

۱۷۶۔ یہ کتاب لیوی پرونفتال نے اڈٹ کرکے چھپوادی ہے ۔

۱۷۷۔ السخاوی ۔ الاعلان بالتوبیخ لمسن ذم التاریخ ص ۱۵۹ ۔

۱۷۸۔

۱۷۹۔ ابن ہشام ۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ۔ ص ۱۲ ، ۲۲

۱۸۰- ابن ہشام - سیرۃ ابن ہشام ج ۳ - ص ۳۰۹

۱۸۱- شرجیل بن سعد قبیلۂ انصار کے غلام تھے - انھوں نے متعدد صحابہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا - اس کے علاوہ انھوں نے زید بن ثابت ، ابوہریرۃ اور ابن عباس جیسے صحابہ سے روایت کی تھی - کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ مغازی کے عالم تھے اور بدریوں کے بارے میں ان کی معلومات خاصی وسیع تھیں جس کی بنا پر لوگ انھیں اہمیت دیتے تھے - لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو اُن کے نقاد ہیں - کہا جاتا ہے شرجیل بن سعد معاشی پریشانی میں مبتلا رہتے تھے - اسی مجبوری کی بنا پر جب وہ کسی کے پاس حاجت روائی کے لیے جاتے اور وہ ان کی ضرورت پوری نہ کرتا تو سخت خفا ہوتے - اسی خفگی میں یہاں تک کہہ دیتے کہ تمھارے باپ نے جنگ بدر میں حصہ ہی نہیں لیا - اس وجہ سے لوگ ان سے ڈرتے تھے - ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کا وقار بھی جاتا رہا تھا - انھیں اسباب کی بنا پر طبری نے ان کی روایات کو اپنی کتاب میں نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے - یہی وجہ شاید ابن اسحٰق کے یہاں رہی ہو -

ابن حجر العسقلانی - تہذیب التہذیب - ج ۴ - ص ۳۲۰ -

۱۸۲- عاصم بن عمر بن قتادۃ قبیلۂ انصار کی ایک شاخ بنو ظفر سے تعلق رکھتے تھے - اس قبیلے نے غزوۂ بدر میں آنحضرت کا ساتھ دیا تھا - قتادۃ جنگِ حنین میں اپنے قبیلے کا جھنڈا لیے ہوئے پیشوائی کر رہے تھے - عاصم کے والد حدیث سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ بیٹے نے باپ سے احادیث کی سماعت کی - عاصم عام طور پر مالی مشکلات میں مبتلا رہتے تھے جس سے مجبور ہو کر اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا سہارا لیا - انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا قرض ادا کر دیا بلکہ ان سے درخواست کی کہ مسجد میں بیٹھ کر مغازی کی تعلیم دیا کریں - وہ یہ کام عرصے تک کرتے رہے - پھر مدینے چلے گئے جہاں تقریباً بیس سال یہی کام انجام دیتے رہے - ان کے شاگردوں میں معمر بن راشد کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے - عاصم نے فن مغازی پر ایک کتاب بھی تالیف کی تھی - ان کے کوئی اولاد نہیں تھی -

ابن قتیبہ - کتاب المعارف ص ۱۶۱ - ابن حجر العسقلانی - تہذیب التہذیب ج ۱۰ - ص ۵۳ - ۵۴ -

١٨٣- ابن جریر الطبری، فہرست طبری۔ ص ٣٠٣

١٨٤- ابن ندیم۔ الفہرست۔ ص ١٥٠

١٨٥- ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل و الملوک ج ٣۔ ص ١٧٥٥

١٨٦- سخاوی۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ۔ ص ٨٨۔ ٨٩

١٨٧- وہب بن منبہ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ یہودی النسل تھا۔ لیکن ہورووتس کا خیال ہے کہ وہ ایرانی تھا۔ ان کا خاندان نوشیرواں کسریٰ کے عہد میں ہرات سے آکر جنوبی عرب میں آباد ہوگیا تھا۔ ان کی پیدائش سے پہلے ہی گھر میں اسلام داخل ہوچکا تھا۔ اس لیے وہب پیدائشی مسلمان ہی تھے۔ یہ صوبۂ یمن کے ایک مقام ذمار میں حضرت عثمان کے دور میں پیدا ہوئے۔ ان کے سال ولادت میں اگرچہ اختلاف ہے تاہم زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ وہ ٣٤ھ میں پیدا ہوئے۔ یہیں اس کی پرورش بھی ہوئی تھی۔ اور مروجہ علوم سے متعارف ہوئے۔ یہ نہیں معلوم کہ اس نے سب سے پہلے کب حجاز کا سفر کیا۔ وہ اپنے وطن میں قاضی بھی مقرر ہوا۔ لیکن زیادہ دنوں تک اس سرکاری عہدے پر برقرار نہیں رہ سکا۔ کیونکہ اس کی طبیعت بچپن ہی سے زہد کی طرف مائل تھی۔ شاید جوانی ہی میں اس نے تحصیل علم کے لیے مدینہ کا رخ کیا۔ وہ اکثر مدینہ جاتا رہتا تھا جہاں اس کے قیام کی مدت خاصی طویل ہوتی تھی۔ حاجی خلیفہ کا خیال ہے کہ اس نے ابن عباس کی معیت میں ١٣ سال گذارے۔ ان کے علاوہ ابوہریرہ سے عرصے تک کسب فیض کرتا رہا۔ یافعی کا کہنا ہے کہ وہب نے ابن عباس، ابوہریرہ اور دیگر صحابہ سے ملاقات کی تھی اور ان سے احادیث روایت کی ہے۔ وہب کی زاہدانہ زندگی کے عجیب عجیب واقعات مذکور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے چالیس سال تک کسی جاندار کو گالی نہیں دی۔ بیس سال تک عشا اور فجر کے درمیان وضو نہیں کیا۔ اور چالیس سال تک بستر پر نہیں سویا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قدریت کی جانب مائل تھا۔ آخر میں اسے گرفتار کرلیا گیا۔ لیکن اس کی وجہ نہیں معلوم اور اسے قیدخانے میں کوڑے سے مارا گیا جس کی وجہ سے جانبر نہ ہوسکا۔ اس کے انتقال کا سال ١١٠ھ یا ١١٤ھ بتایا جاتا ہے۔

ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ ج ١۔ ص ١٠٠-١٠١۔ ابن الجوزی، صفۃ الصفوۃ ج ٢۔ ص ١٦٤-١٦٧
یافعی۔ مرآۃ الجنان۔ ج ١۔ ص ٢٤٨۔ ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری بحث فی نشاۃ علم التاریخ

Marfat.com

عند العرب۔ ص ۱۰۳۔ ۱۱۳۔ سخاوی۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ۔ ص ۸۸۔ ۸۹۔

۱۸۸- معتمر غالباً ۱۰۶ھ میں یمن میں پیدا ہوا۔ یہیں اس نے پرورش پائی۔ اگر وہب کا انتقال ۱۱۴ھ مان لیا جائے تو اس کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ معتمر نے وہب کو دیکھا ہو۔ وہ یمن سے بصرہ چلا آیا تھا۔ جہاں علم حدیث کی تحصیل میں لگا رہا۔ اس نے اپنے باپ اور منصور کے علاوہ بے شمار لوگوں سے روایت کی ہے۔ فن حدیث پر اچھی نظر ہونے کی وجہ سے اس کو بصرے کا محدث کہا جاتا تھا۔ اس نے حفظ بھی کیا تھا۔ لوگ اسے ثقہ مانتے تھے اور عابد و صالح ہونے کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ اس سے روایت کرنے والوں میں احمد بن حنبل خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس نے مغازی پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کا انتقال ۱۸۷ھ میں ہوا۔

ذہبی۔ میزان الاعتدال۔ ج ۳۔ ص ۱۸۳۔ یافعی۔ مراۃ الجنان ج ۱۔ ص ۴۰۴۔
ابن العماد۔ شذرات الذہب۔ ج اول۔ ص ۳۱۶۔ زرکلی' الاعلام ج ۸۔ ص ۱۷۹۔

۱۸۹- ذہبی۔ میزان الاعتدال ج ۳۔ ص ۱۸۸

۱۹۰- السخاوی۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ، ص ۱۵۹۔

۱۹۱- ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۱۔ ص ۹۱

۱۹۲- " " " ص ۲۶۶

۱۹۳- " " ج ۶۔ ص ۲۹۶۳

۱۹۴- معمر بن راشد۔ غالباً ۹۶ھ کے لگ بھگ شہر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں چونکہ بصرہ علم و فن کا مرکز تھا۔ اس لیے معمر کو اپنی تعلیم میں بڑی آسانی پیدا ہوئی۔ معمر کی کنیت ابو عروۃ تھی۔ اور وہ قبیلۂ ازد کے غلام تھے۔ بصرے میں انھوں نے حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کرکے ان مضامین میں شہرت پیدا کی۔ یہ اپنے زہد اور ورع کی بنا پر بھی مشہور تھے۔ یہ بصرے کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی آیا جایا کرتے تھے۔ ان کی اس تعلیمی مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے حدیث کی تحصیل میں یمن کا سفر کیا اور ہمام بن منبہ سے مل کر ان سے حدیث کی روایت کی۔

Marfat.com

وہ تجارت کی غرض سے بھی سفر کیا کرتے تھے۔ اس سے انھیں آسانی ہوتی تھی۔ انھوں نے زہری سے اپنی ملاقات کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

ایک بار عبدالواحد بن زیاد نے ان سے پوچھا کہ تم نے زہری سے کس طرح سماعت کی؟ معمر نے جواب دیا۔" میں تجارت کی غرض سے جاتے ہوئے مدینہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک شیخ کے پاس جا رہے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہولیا۔ اس طرح مجھے زہری سے سماعت کا موقع ملا۔ انھوں نے ہشام بن عروہ سے بھی استفادہ کیا۔ معمر بن راشد کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ بڑے با اخلاق تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ بڑے حلیم اور بامروت انسان تھے۔ ان کی قناعت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک بار معین بن زائدہ جو یمن کے گورنر تھے انھوں نے تھوڑا سا سونا ان کے پاس بھیجا تو اسے واپس کر دیا۔ معمر کی انہی خوبیوں کی بنا پر اہل یمن نے بصرہ واپس نہیں آنے دیا۔ یہاں ان کی شادی کر دی۔ اس طرح وہ یمن کے ہو رہے۔ ان کا انتقال ۱۵۳ھ میں ہوا۔ عبدالمنعم کا خیال ہے کہ وہ ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

ابن العماد۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۵ ۔ ابن سعد، طبقات ابن سعد، ج ۵ ص ۳۹۷ ۔ یافعی، مراۃ الجنان ج ۱ ص ۳۲۳۔ ذہبی، میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۱۷۲ ۔ ابن ندیم، کتاب الفہرست ص ۱۴۴۔ ابن حجر العسقلانی، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۴۳۔ ۲۴۶۔

۱۹۵۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۴۔

۱۹۶۔ ابن العماد۔ شذرات الذہب، ج ۱، ص ۲۳۵۔

۱۹۷۔ ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک، ج ۲، ص ۱۱۵۵۔

۱۹۸۔ " " " " ص ۱۱۶۰

۱۹۹۔ " " " " ص ۱۴۵۱

۲۰۰۔ " " " " ص ۱۵۴۹۔ ۱۵۵۰۔ ۱۵۵۱۔

۲۰۱- یافعی- مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۳۲۳

۲۰۲- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۳-۲۴۶

۲۰۳- ابن سعد- طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۹۷

۲۰۴- واقدی- کتاب المغازی ص ۶۴-۸۶

۲۰۵- ابن جریر الطبری- تاریخ الرسل والملوک ج ۵ ص ۲۸۰۰

۲۰۶- ابن الندیم- کتاب الفہرست ص ۱۴۴

۲۰۷- موسیٰ بن عقبہ بن ربیعۃ بن ابی ایاش آل زبیر کے پروردہ مدینے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں پلے بڑھے اور تحصیل علم کے تمام مراحل طے کیے۔ انھوں نے ایک صحابیہ کو بھی دیکھا تھا اس لیے تابعی کہلائے۔ تذکرے کی کتابوں میں اس سے زیادہ ان کی زندگی کے حالات نہیں ملتے۔ البتہ ان کی سرگرمیوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فقہ میں مہارت پیدا کی تھی اور مفتی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ انھوں نے قرآن بھی حفظ کر لیا تھا۔ حدیث و مغازی پر بھی نظر رکھتے تھے۔ احمد بن حنبل نے ان کو ثقہ اور ان کی مغازی کو مستند مانا ہے۔ ان کی مغازی سے احادیث کو منتخب کرکے ایک مجموعہ بھی تیار کیا گیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۴۱ھ میں ہوا۔

ذہبی- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸

ابن حجر العسقلانی- تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۰-۳۶۲

یافعی- مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۲۹۲

خیر الدین الذرکلی- الاعلام- ج ۸ ص ۲۷۶

۲۰۸- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۹-۲۱۰

۲۰۹- ابن حجر العسقلانی- تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۲-۳۶۰

۲۱۰- ذہبی- میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۱۴

۲۱۱- " - تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۸

۲۱۲- " " ج ۱ ص ۱۴۸

۲۱۳- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۹-۲۱۰

Marfat.com

۲۱۴- سخاوی - الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۱۵۷- ۱۵۸-

۲۱۵- ذہبی - میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۱۴

۲۱۶- ابن سعد- کتاب الطبقات ج ۵ ص ۱۳۱ اس کا انتقال ۱۵۸ھ میں ہوا-

۲۱۷- اشپرنگر کو دمشق میں یہ بتایا گیا کہ موسیٰ کی مغازی کا اصل نسخہ یہاں موجود ہے لیکن کوشش کے باوجود اس کو دستیاب نہ ہوسکا-

۲۱۸- خیر الدین الزرکلی - الاعلام ج ۸ ص ۲۷۶

۲۱۹- ابن سعد، کتاب الطبقات ج ۳ ص ۲۴۱- ج ۸ ص ۱۹۱- ۱۹۰- ۱۷۱- ۱۱- ۱۰-

۲۲۰- ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۳ ص ۱۸۵۱- ۲۰۱۴- ج ۵ ص ۲۷۵۵- ۲۹۸۱- ج ۶- ص ۳۱۷۳- ج ۷ ص ۳۹۷- ج ۸ ص ۱۲۳۱

۲۲۱- اصفہانی - کتاب الاغانی ج ۳ ص ۱۶

۲۲۲- ابن سعد- کتاب الطبقات ج ۱ ص ۱۰ ج ۳ ص ۱

۲۲۳- ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۱ ص ۲۵۰- ج ۳ ص ۱۸۰۱- ج ۴ ص ۲۰۱۴-

۲۲۴- ابن جریر الطبری - تاریخ الرسل والملوک ج ۵ ص ۲۱۶

۲۲۵- ابن سعد- کتاب الطبقات ج ۵ ص ۲۱۶

۲۲۶- بلاذری - فتوح البلدان ص ۸۰

۲۲۷- ابن سعد- کتاب الطبقات ج ۳ ص ۲۴۱

۲۲۸- محمد بن اسحٰق کے دادا غالباً عیسائی تھے۔ خالد بن ولید نے عراق میں ۱۲ ہجری کے دوران عین التمر کے مقام پر انھیں قید کیا تھا- خالد بن ولید نے بعد میں ان کو مدینے بھیج دیا جہاں سے وہ رہا کر دیے گئے- یسار کے تین لڑکے تھے- ایک کا نام اسحٰق دوسرے کا موسیٰ تھا- تیسرے کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا- اسحٰق اور موسیٰ دونوں حدیث سے شوق رکھتے تھے چنانچہ دونوں نے حدیث روایت کی ہے- اسحٰق نے حضرت معاویہ کو دیکھا تھا اور عروۃ بن الزبیر کے شاگرد بھی تھے- البتہ محمد کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ اس نے عروۃ سے استفادہ کیا تھا کہ نہیں- کیونکہ اس کی عمر عروۃ کے انتقال کے وقت کوئی دس سال کی رہی ہوگی- بہرحال

محمد کے باپ عروۃ کے شاگرد تھے ہی، اس لیے آنا جانا رہا ہوگا۔ اس طرح محمد کو عروۃ سے استفادہ کا ضرور موقع ملا ہوگا۔ محمد نے اپنے باپ سے ان احادیث اور مغازی کی روایات کو اخذ کیا تھا جو عروۃ سے ماخوذ تھیں۔ اس کے باپ فن حدیث میں ثقہ مانے جاتے تھے۔ ابوزرعۃ کا قول ذہبی نے نقل کیا ہے جس میں اس خیال کا اظہار ملتا ہے۔ تاریخ بغداد کے حوالے سے ابن خلکان نے یہ روایت نقل کی ہے کہ اس نے انس بن مالک کو دیکھا تھا۔

محمد بن اسحق کی پیدائش عام اندازے کے مطابق ۸۵ھ میں ہوئی۔ اس کے دو بھائی اور تھے۔ ایک کا نام عمر اور دوسرے کا اسحق تھا۔ یہ دونوں بھی حدیث کے راوی گزرے ہیں۔ چونکہ گھر میں حدیث کا چرچا تھا اس لیے محمد نے بھی اس مضمون سے دلچسپی لی۔ مدینے کے تمام بزرگ تابعین سے تعلق پیدا کیا مثلاً عاصم بن عمر عبداللہ بن ابی بکر، اور ابن شہاب الزہری وغیرہ۔ نیز اس نے مقبری، اعرج اور ان کے معاصرین سے بھی روایت کی ہے۔ محمد کے تعلقات عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی تھے جو اس کو تاریخ الانبیاء پر مواد فراہم کرتے تھے۔ محمد نے تحصیل علم کے لیے بلاد اسلامیہ کے اہم مراکز کا سفر کیا۔ وہ اسکندریہ، بصرہ، کوفہ، جزیرہ اور الری گیا۔ بالآخر اس نے بغداد کو اپنا مستقر بنالیا۔ یہاں اس کو خلیفہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اس کے آخری ایام بڑے آرام سے گزرے۔ اس کے انتقال کے سال میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ۱۵۰ھ اور ۱۵۱ھ زیادہ مستند مانے جاتے ہیں۔ البتہ ابن خلکان کا اصرار ہے کہ صحیح تاریخ ۱۵۱ھ ہے۔ اس کو ابو حنیفہ کی قبر کے پاس خیزران میں دفن کر دیا گیا۔

ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۲

یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۳۹۹-۴۰۱

ذہبی۔ تراجم الرجال ص ۴

ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱ ص ۱۷۲-۱۷۴۔

ذہبی۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۱۔۲۴

ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۳ ص ۴۰۵۔۴۰۶

ابن العماد۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰

۲۲۹۔ السخاوی۔ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۱۵۷

۲۳۰۔ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۳ ص ۴۰۵

۲۳۱۔ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۰۰

۲۳۲۔ ابن العماد۔ شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰

۲۳۳۔ " " "

۲۳۴۔ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۰۱

۲۳۵۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۱۰

۲۳۶۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۲

۲۳۷۔ " " " "

۲۳۸۔ ذہبی۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴

۲۳۹۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۲

۲۴۰۔ میں نے قسطنطنیہ کی لائبریری کے مخطوطات کی فہرست کو دیکھا تو اس میں سیرۃ ابن اسحق کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا گیا تھا۔ اور اس کے موجود ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ لیکن پروفیسر ہرودتس نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ "میں نے یہ نسخہ غور سے پڑھا اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ابن اسحق کا اصل نسخہ نہیں ہے بلکہ سیرۃ ابن ہشام ہی ہے" لیکن اس کا اصلی نسخہ مل گیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔ (محمود الحسن)

۲۴۱۔ ابن ہشام۔ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۶۱

۲۴۲۔ ابن الخطیب۔ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۱

۲۴۳۔ Josef Horovitz – The Earliest Biographies of The Prophet and Their authors. Islamic Culture vol 2 p. 176

Marfat.com

۲۴۴- یاقوت الحموی- ارشاد الاریب ج ۶ ص ۶۰۰

۲۴۵- Josef Horovitz The Earliest Biographies of The Prophet And Their Authors. Islamic culture vol 2/172

۲۴۶- سلمۃ بن الابرش شہر الری کے قاضی تھے اور ابن اسحق کی مغازی کے راوی- ان کا انتقال ۱۹۰ھ میں ہوا- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۵۳

۲۴۷- ابن الاثیر- اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ- ج ۱ ص ۱۱

۲۴۸- ابن حجر العسقلانی- الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ج ۱ ص ۶۱

۲۴۹- یاقوت الحموی- ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۰۱

۲۵۰- ذہبی- تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸۷

۲۵۱- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۰۵

۲۵۲- یاقوت الحموی- ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۰۱- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۰۵

۲۵۳- روی عن اسحق بن علی وعروۃ بن الزبیر وروی عن ابنہ- ابن حجر العسقلانی ج ۱ ص ۲۵۲

۲۵۴- طبری- فہرست طبری-

۲۵۵- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۳۴

۲۵۶- " " " ج ۹ ص ۹۳- محمد بن جعفر بن الزبیر متوفی ۱۱۰- ۱۲۰ھ کان من فقہاء المدینۃ-

۲۵۷- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۱۴- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۵۴- بعثہ عمر بن عبدالعزیز الی مصر یعلمہم السنن

۲۵۸- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۹۱- ذہبی- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۱- توفی بالاسکندریہ ۱۱۷ھ

۲۵۹- ذہبی- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۷- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۵۷- توفی ۱۲۰ھ روی عنہ یحیٰی بن سعید، ہشام بن عروۃ ومحمد ابن اسحق-

۲۶۰- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۵۴- توفی ۱۳۱ھ من المفسرین والمحدثین-

۲۶۱- " " ج ۱۱ ص ۵۰- ۵۱- توفی ۱۴۵، ۱۴۶ھ

Marfat.com

۲۶۲- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۳۱۹ - ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱
ص ۱۷۵ توفی ۱۲۸ھ کان مفتی اہل معرفی زمانہ -

۲۶۳- ذہبی- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۰ توفی ۱۲۵-۱۲۶ھ

۲۶۴- ابن حجر- تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۲۰ - کانت لہ کتب -

۲۶۵- ذہبی- تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۱

۲۶۶- محمد بن عبداللہ الازرقی - اخبار مکۃ ج اول ص ۲۱ - ۳۰ - ۳۸ - ۶۵

۲۶۷- ابن ہشام- سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۸۶ - ۱۱۱ - ۱۱۴ - ۱۱۵ - ۱۵۷

۲۶۸- " " ج ۱ ص ۴۹ - ۵۰ - ۱۰۲ - ۱۰۳ -

۲۶۹- ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک ج ۴ ص ۱۸۲۳

۲۷۰- " " " ج ۱ ص ۲۳۶

۲۷۱- ذہبی - میزان الاعتدال ج ۲ - ص ۲۱ - ۲۴

۲۷۲- ابن ندیم - کتاب الفہرست ص ۱۴۲

۲۷۳- کان من حدیث احد، کما حدثنی محمد بن مسلم الزہری، محمد بن یحیی،
ابن حبان، عاصم بن عمر بن قتادۃ، والحصین بن عبدالرحمن بن عمر بن سعد
بن معاذ وغیرہم من علمائنا کلہم قد حدث ببعض الحدیث لمن یوم احد
قد اجتمع حدیثہم کلمہ فیما سقت من ہذا الحدیث من یوم احد، قالوا
اومن قال منہم - سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۶۰

۲۷۴- ابن العماد- شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۳۰

۲۷۵- ابن ندیم- کتاب الفہرست ص ۱۴۲

۲۷۶- ابو معشر کا نام نجیح بن عبدالرحمن تھا- یہ شخص بنی مخزوم کی ایک عورت کا سکرٹری تھا-
بعد میں ام موسیٰ بنت منصور کی ماتحتی میں آیا جس نے اس کو آزاد کر دیا تھا- اس
کی تاریخ ولادت کا صحیح پتہ نہیں- البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ گورا چٹا اور خاسا موٹا تھا-
یہ مقام سندھ سے تعلق رکھتا تھا جہاں سے بحیثیت غلام اس کو مدینہ لایا گیا- اس نے
مدینے میں محمد بن کعب القرظی اور موسیٰ بن یسار سے روایت کی ہے- مدینے سے خلیفہ
مہدی بغداد آیا تو ایک ہزار روپے سے اس کی امداد کی اور آخر تک اس کی سرپرستی

Marfat.com

کرتا رہا۔ اس کا انتقال ۲۰۰ھ میں ہوا۔ نماز جنازہ ابن الزبیر نے پڑھائی۔
ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۴۴-۲۴۵- یافعی مراۃ الجنان ج ۱ ص ۲۰۱
ابن العماد، شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۸

۲۷۷- ابن الندیم، کتاب الفہرست ص ۱۴۲

۲۷۸- ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۱۴

۲۷۹- ابن سعد، طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۰۹- کان کثیر الحدیث ضعیفاً

۲۸۰- ابن جریر الطبری، تاریخ الرسل والملوک ج ۱۰ ص ۱۰۵

۲۸۱- ابن العماد، شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۰۸

۲۸۲- ابو عبداللہ محمد بن عمر بن واقدی ۱۳۰ھ میں شہر مدینہ میں پیدا ہوا۔ یہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ چنانچہ اس دور کے متعدد شیوخ مدینہ سے استفادے کا موقع ملا۔ اس کے اساتذہ میں ابن ابی ذوئیب، معمر بن راشد، مالک بن انس، ابن جریج، ابن عجلان، ثور بن یزید، محمد بن عبداللہ، ربیعہ بن عثمان، اسامہ بن زید، عبدالحمید بن جعفر اور ابو معشر وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ واقدی کا آبائی پیشہ رنگ ریزی کا تھا۔ اس پیشے سے اس نے بڑی دولت کمائی تھی۔ لیکن یہ دولت زیادہ دنوں تک ساتھ نہیں دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰ھ میں بغداد چلا آیا جہاں کسب معاش کے ذرائع پیدا کرنے میں مصروف رہا۔ بغداد آنے کے بعد اس کا تعارف مشہور مربی علم و فن یحییٰ بن خالد البرمکی سے ہوا۔ یحییٰ نے اپنے شہرۂ آفاق علم دوستی کے مطابق واقدی کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور اس کے لیے اپنے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ غالباً اسی کے توسط سے وہ دربارِ عباسی میں باریاب ہوا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ مامون اس کی طرف مائل ہوا۔ اس دوران اس نے متعدد شہروں کا دورہ کیا۔ شام و دمشق جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن بغداد کی کشش دوبارہ اسے کھینچ لائی۔ جب یہاں آیا تو سرکاری توجہ میں اور اضافہ ہوا۔ مامون نے خصوصی لطف و عنایت سے کام لیا۔ واقدی چونکہ بڑا سخی تھا اس لیے مال و دولت کی قدر اس کے نزدیک نہیں تھی اور اکثر وہ خالی ہاتھ رہتا تھا۔ مامون کی طرف سے مقررہ ماہوار رقم کے علاوہ اتفاقی امداد بھی ہو جایا کرتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ خط کا ذکر برمحل

ہوگا جو اس نے مامون کو لکھا تھا۔ جواب میں مامون نے تحریر کیا "تمہارے اندر دو صفات ہیں ایک تو فیاضی کی اور دوسری حیا کی۔ سخاوت کی صفت تم کو سب کچھ خرچ کر دینے پر ابھارتی ہے اور حیا تم کو مانگنے سے روکتی ہے۔ تم نے قرض کی جو رقم لکھی ہے وہ بہت کم ہے۔ اس لیے میں نے مطلوبہ رقم کا دوگنا عطا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر اس سے پوری نہ ہو تو اس کی ذمہ داری تم پر ہے کہ تم نے بہت کم رقم کا ذکر کیا ہے۔ اور اگر تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو اپنے ہاتھ کو اور کشادہ کر لو، خوب خرچ کرو کیونکہ خدا کا خزانہ کھلا ہوا ہے اور اس کا ہاتھ بھی کشادہ ہے۔ لیکن اس سرکاری سرپرستی کے باوجود اس کی عسرت میں کمی نہیں آئی۔ اور وہ اپنے لاابالی پن کی بنا پر تنگ دستی سے گزر بسر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کی مفلوک الحالی کا یہ عالم تھا کہ کفن کے لیے پیسہ تک نہ تھا۔ ابن الخطیب نے لکھا ہے کہ جس وقت واقدی کا انتقال ہوا ہے تو قضاء کے عہدے پر مامور تھا۔ جب مامون کو معلوم ہوا کہ واقدی کو کفنانے کے لیے پیسے نہیں ہے تو فوراً بھیجا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ واقدی کا انتقال ۲۰۷ھ میں ہوا۔

ابن ندیم، کتاب الفہرست ص۔ ۱۵۰۔ ذہبی، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ابن العماد، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۸۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب ج ۹۔ ص ۳۶۳۔ ۳۱۸۔ خیر الدین الزرکلی، الاعلام ج ۷۔ ص ۲۰۰۔

۲۸۳۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب، ج ۹ ص ۳۶۲

۲۸۴۔ " " ج ۹ ص ۳۶۳

۲۸۵۔ ذہبی، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۰

۲۸۶۔ یاقوت الحموی، ارشاد الاریب، ج ۷، ص ۵۸

۲۸۷۔ ذہبی، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۱۔ یاقوت الحموی نے واقدی کے مجموعی کتابوں کی تعداد ۲۸ بتایا ہے جن میں سے اکثر فن تاریخ پر ہیں۔ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۷، ص ۵۸۔

۲۸۸۔ ابن الندیم، کتاب الفہرست ص ۱۵۰

۲۸۹۔ Josef Horonitz The Earliest Biographies of the Prophit and their Authors Islamic Culture 2/517

Marfat.com

۲۹۰- الواقدی، کتاب المغازی ص ۲-۷

۲۹۱- " " ص ۱۱

۲۹۲- " " ص ۴۳، ۱۲۶، ۱۳۳

۲۹۳- قال استخلف رسول اللہ ابا لبابۃ بن عبد المنذر علی المدینۃ ثلث مرات، بدر القتال، وبنی قینقاع غزوۃ السویق فی ذی الحجۃ" کتاب المغازی ص ۱۸۱

۲۹۴- ابن الخطیب، تاریخ بغداد ج ۳ ص ۶

۲۹۵- ابن الخلکان، وفیات الاعیان ج ۳ ص ۴۷۱

۲۹۶- " " "

۲۹۷- ابن ندیم، کتاب الفہرست ص ۱۵۰

۲۹۸- ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک ج ۱۰ ص ۶۳۹

۲۹۹- " " " "

۳۰۰- محمد بن سعد بن منیع الزہری شہر بصرہ میں ۱۶۸ھ میں پیدا ہوا۔ یہیں اس کی پرورش ہوئی۔ اور تعلیم بھی حاصل کی۔ اس نے سفیان بن عیینۃ اور اس کے ہم عصروں سے کسب فیض کیا۔ بعد میں وہ بغداد چلا گیا جہاں اس کو مطالعہ کرنے اور مشہور علماء سے استفادے کا موقع ملا یہیں اس نے واقدی سے اپنے تعلقات استوار کیے۔ بعد میں گہری دوستی ہو گئی۔ ابن سعد کو حدیث، سیرۃ اور تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس نے ان مضامین میں کمال پیدا کیا۔ اور ان مضامین میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ واقدی کی بیشتر کتابوں کی تلخیص کی اور انھیں مرتب کیا جن کی بنا پر وہ محفوظ رہ سکی ہیں۔ اس سے روایت کرنے والوں میں ابوبکر بن ابی الدنیا، ابو محمد حارث بن ابی اسامۃ بھی تھے۔ اکثر لوگ اس کو ثقہ مانتے تھے۔ ابن خلکان نے اس کو جلیل القدر عالم اور ثقہ تسلیم کیا ہے۔ اس کا انتقال بغداد میں ۲۳۰ھ میں ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال کی تھی۔

ذہبی، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۶۳۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان ج ۳ ص ۴۷۳۔ یافعی، مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۰۰۔ ابن ندیم، کتاب الفہرست ص ۱۵۱۔

Marfat.com

۳۰۱- وفیات الاعیان۔ ج ۴۔ ص ۳۰۴

۳۰۲- ابن ندیم۔ کتاب الفرست۔ ص ۱۵۱

تیسرا باب

فتوح و احداث نگاری کا دور

حدیث کا فن مسلمانوں کے فکر و عمل سے خصوصی تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اس ذخیرے کو معلوم کرنے اور اس کو محفوظ کرنے کی فکر پیدا ہوئی۔ حدیث کے دائرے میں آنحضرت ﷺ، صحابہ اور تابعین کے افکار اور ان کے عملی کارنامے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ اس ذخیرے کو محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ خیال ایک قدرتی امر تھا جس کو تاریخی ضرورتوں نے پیدا کیا تھا۔ عرب معاشرے کو بالکل ہی نئے حالات کا سامنا تھا۔ متعدد داخلی و خارجی محرکات اس معاشرے کو درپیش تھے۔ سیاسی حالات، جغرافی تبدیلیاں اور اس کے نتیجے میں متعدد نسلی گروہوں کا اختلاط ایک نئے سماج کا مسئلہ پیدا کر چکے تھے۔ عربوں کے لیے یہ زبردست مسئلہ تھا۔ انھوں نے اس کا سامنا کرنے کے لیے کئی محاذوں پر تیاری شروع کر دی۔ یہ محاذ سیاسی، تنظیمی، علمی، قانونی اور معاشرتی محاذ تھے۔ ان محاذوں پر ان کا رویہ ہمیشہ اور بہرصورت یکساں نہیں تھا۔

Marfat.com

لیکن ایک بات اکثر حالات میں مشترک تھی وہ یہ کہ اس رویے کے پیچھے شعوری وغیر شعوری طور پر مذہب کی روح بھی ایک محرک تھی۔ اس کا اظہار عربوں کی اجتماعی زندگی کے ایک اہم پہلو یعنی قانون کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات کو برتنے کی علمی کوشش کی صورت میں ہوا۔ اس تشکیل میں فقہاء کو آنحضرت، صحابہ اور تابعین کے طرز عمل اور ان کے خیالات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہی لوگ رسول اللہ صلعم کے اقوال و اعمال سے براہ راست یا بالواسطہ واقفیت رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ لوگ ان کارناموں میں بھی شریک تھے اس لیے ان کے منصوبوں اور خیالات کو جاننے کی فکر پیدا ہوئی اس ضرورت کا احساس تاریخ نگاری کے دیگر محرکات میں سے ایک اہم محرک تھا۔ مثال کے طور پر مفتوحہ زمینوں کی تقسیم، خراج کے مسائل، فاتح و مفتوح قوموں کے مابین تعلقات کی نوعیت، ٹیکس کی ادائیگی، اس کی شرح، غنیمت کی تقسیم، اور اس کے گریڈ وغیرہ دیگر مسائل پر قوانین بناتے وقت صحابہ اور تابعین کے افعال کو نمونہ بنایا گیا۔ ان واقعات اور مثالوں کی تلاش کے نتیجے میں فتوح و احداث کے موضوع سے علماء نے خصوصی دلچسپی لی۔ اس طرح اس موضوع سے دلچسپی لینے والوں کا ایک گروہ وجود میں آیا۔ جو یہی کام کرتا تھا کہ صدر اسلام کی جنگوں، خلفاء راشدین اور دیگر ادوار اسلامی کی جنگوں کے حالات بالتفصیل معلوم کر کے انھیں تحریری شکل میں لائیں کیونکہ وظائف کی تقسیم، زمینوں کی نوعیت، اس پر ٹیکس کا تعین شرح کا، جنگ کی نوعیت کے مطابق ہی ہوتا تھا۔ ان مسائل سے دلچسپی کی ایک اور وجہ بھی تھی جسے ہم خالص معاشی بھی کہہ سکتے ہیں۔ فقہاء کو جب ان معلومات کی ضرورت ہوئی تو وہ علماء احداث کی طرف متوجہ ہوئے جو بعض اوقات ان معلومات کو

فراہم کرتے اور اس کا معاوضہ حاصل کرتے تھے۔ ان متعدد محرکات کی بنا پر احداث کے موضوع پر اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو گیا۔

لیکن یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ فتوح سے دل چسپی کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ پہلی صدی کے نصف اول ہی میں اس مواد سے دل چسپی پیدا ہو گئی تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو اس میدان میں تالیفات بھی شروع ہو چکی تھیں۔ مغازی و سیر کے اکثر مولفین اخبار و احداث کے بھی عالم تھے۔ ابن شہاب الزہری، محمد بن اسحق، معمر بن راشد، اور ابو معشر احداث و فتوح جیسے موضوع سے شغف رکھتے تھے۔ اس سے یہ رائے بھی قائم کی جا سکتی ہے کہ سیرۃ و مغازی سے دل چسپی کے پہلو بہ پہلو فتوح سے متعلق واقعات بھی قلم بند ہونے لگے تھے۔ چنانچہ جب ہم یہ روایت پڑھتے ہیں کہ زہری کے مسودات جانوروں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاتے تھے تو ہمارا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ ضخیم سرمایہ محض مغازی کے مواد پر مشتمل نہیں رہا ہو گا بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ اس کا تعلق حدیث و فتوح جیسے موضوعات سے بھی ہو۔ اس پہلو پر زور دینے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے معاصرین اور بعد کے مولفین نے جو لٹریچر اس موضوع پر چھوڑا وہ تاریخی تسلسل رکھتا تھا جو خاصا پرانا ہے۔

فتوح و احداث کے موضوع پر کام کرنے اور ان پر کتابیں تصنیف کرنے کا سلسلہ خاصا پرانا ہے۔ چنانچہ اس گروہ میں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے صدر اسلام ہی میں مغازی کے موضوع پر کتابیں تصنیف کرنی شروع کر دی تھیں۔ مغازی کے ان مصنفین نے اس موضوع پر اپنے پیچھے کافی مواد چھوڑا تھا۔ ان لوگوں نے کبھی تو اپنی اس کتاب ہی میں جو

Marfat.com

مجموعی طور پر فن مغازی سے تعلق رکھتی تھی فتوح سے متعلق مواد کو جمع کیا تھا لیکن عام طور پر علحدہ سے مستقل کتابیں اس موضوع پر تصنیف کی تھیں۔ اس سلسلے میں ابو معشر اور واقدی کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بالخصوص موخر الذکر نے فتوح پر علحدہ اور مستقل کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس کی کتابوں میں فتوح الشام، فتوح مصر، فتوح العجم وغیرہ جیسی کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ جو اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ اس موضوع پر تصنیف کا سلسلہ علحدہ موضوع کی حیثیت سے شروع ہو گیا تھا اور اس میدان میں کام کرنے والے علحدہ ایک طبقے کی حیثیت سے وجود میں آ گئے تھے۔ اس گروہ میں مجاہد بن سعید، عوانۃ بن الحکم، ابو مخنف، ہشام بن عروۃ، سیف بن عمر وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اہم اہم تاریخی واقعات و حوادث پر معلومات اکٹھا کیں اور انھیں رسالوں کی شکل میں علحدہ علحدہ جمع کر دیا۔

مجاہد بن سعید ابن عمیر کو اخبار و احداث سے بڑا شوق تھا۔ اگرچہ حدیث سے بھی دلچسپی تھی اور اس نے اس کی سماعت بھی کی تھی۔ تاہم بحیثیت محدّث کے اس کا ذکر نہیں ملتا اور نہ اس کے ہم عصر لوگوں نے اس کو قابلِ ثقہ تسلیم کیا ہے۔ اکثر محدثین اسے کمزور جانتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی روایات کمزور ہوتی تھیں۔ محدثین کی رائے ان کے اپنے نقطۂ نظر کی بنا پر تھی جس کی وجہ سے فن حدیث میں وہ مجاہد کو ضعیف مانتے تھے۔ جہاں تک اس کے اخباری ہونے کا تعلّق ہے اس کے بارے میں مخالف رائے کا ذکر نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فتوحات سے متعلّق بہت سی روایات جمع کر لی تھیں لیکن اس

موضوع پر کسی کتاب کے تالیف کرنے کا ذکر نہیں ملتا۔ تذکرہ نویسوں کی جماعت اس مسئلے پر خاموش ہے۔ البتہ ہثیم بن عدی نے اس سے روایت کیا تھا جس کے ذریعے مجاہد کی روایات گو بہت قلیل تعداد میں سہی، کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ مجاہد کا انتقال سنہ ۱۴۴ھ میں ہوا تھا۔

فتوح واحداث کے موضوع پر کام کرنے والوں میں عوانہ کا نام بہت مشہور ہے[۲]۔ عوانہ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا جو عرصے سے شام میں آباد تھا۔ چونکہ اس قبیلے کے لوگ ممتاز، بااثر اور باحیثیت مرتبے کے مالک تھے۔ اس لیے ان لوگوں کا اموی حکومت سے سابقہ ہونا ایک ضروری امر تھا۔ عہد اموی کی ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز چونکہ شام تھا جہاں امیر معاویہ برسوں گورنر رہ چکے تھے، اس لیے اس علاقے کی اکثر سیاسی و فوجی سرگرمیاں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ قبیلۂ کلب نے بنوامیہ سے اپنے تعلقات استوار کیے جس کی بنیاد باہمی مفاہمت اور تعاون پر تھی۔ اس طرح بنو کلب اموی خاندان کے حلیف بن گئے اور اس قبیلے کے بعض افراد ممتاز فوجی وغیر فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس قریبی تعلق کی بنا پر اس خاندان کے لوگوں کو بنی امیہ کے حالات اور معاملات جاننے کا موقع ملا۔ بلکہ بعض اوقات وہ ان کے اندرونی اور مخفی حالات تک سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ عوانہ اگرچہ مستقل طور پر کوفہ میں رہتا تھا لیکن اپنے خاندان سے وہ مسلسل رابطہ قائم کیے ہوا تھا اور اکثر وہاں آیا جایا کرتا تھا[۳]۔ یہ رابطہ عوانہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ اس ذریعے سے وہ عام حالات تو معلوم ہی کر لیتا تھا لیکن بعض اوقات اس کو اندرونی باتوں کو پتہ چلانے میں آسانی بھی ہوتی تھی۔ عوانہ کو اپنی اس اہم حیثیت کا

Marfat.com

بڑا احساس تھا جس پر اسے فخر بھی تھا۔[۴]

عوانہ کو تاریخ، ادب اور فنِ انساب سے خاصی دل چسپی تھی۔[۵] وہ زبان کے باب میں بڑا فصیح مشہور تھا۔ ان مضامین سے دل چسپی اور مناسبت کی بنا پر اس نے ان موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں سے صرف دو کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ ایک کا نام "کتاب التاریخ" اور دوسری کتاب کا نام "کتاب سیرۃ معاویہ و بنی امیہ" تھا۔ افسوس ہے کہ عوانہ کی ان دونوں کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی موجود نہیں ہے۔ یاقوت الحموی نے غالباً اس کی کسی کتاب کو دیکھ کر ہی اسے ثقہ قرار دیا ہے۔[۶]

چونکہ عوانہ بنی امیہ کے دور میں گزرا ہے اور اس خاندان سے اس کے ذاتی مراسم بھی تھے اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ واقعات کے انتخاب میں شامی نقطۂ نظر سے متاثر تھا کیونکہ واقعات کے بارے میں جو بیان شامیوں سے ملا ہے اس کو عوانہ نے اکثر ترجیح دی ہے۔ عوانہ کا یہ رویہ ممکن ہے کہ تجزیاتی رہا ہو کیونکہ وہ کوفہ میں رہ کر انھیں واقعات کے کوفی ساخت سے واقف رہا ہوگا۔ اس نے دونوں نقطہائے نظر کو سامنے رکھ کر جو بیان اس کے نزدیک زیادہ صحیح تھا، اسے منتخب کر لیا ہو۔ عوانہ کا یہ ممکن تقابلی اندازِ فکر اس مخصوص انفرادی و خاندانی زندگی کا منطقی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ عوانہ نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعی طور پر قابلِ اعتماد ہیں۔ ان واقعات میں اس کے ذاتی رجحان کا بہت زیادہ اثر نہیں ہے۔ اس کے ثبوت میں ان روایات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔

ایسی کئی روایات مل جاتی ہیں جن پر ایک نظر ڈالتے ہی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اموی مفاد کے خلاف ہیں۔ ان روایات سے مدنی اور عراقی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔[۸]

عوانہ کی ان روایات کو ابن الکلبی، اور مدائینی نے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ انھیں کے ذریعے اس کی روایات ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ ان لوگوں نے یہ روایات یا تو براہِ راست عوانہ سے سن کر جمع کی تھیں یا اس کی کتابوں کو پڑھ کر حاصل کیا تھا۔ بہر صورت عوانہ کی روایات کا جو بھی نمونہ ہمارے سامنے ہے وہ ان مورخین کے ذریعہ طبری وغیرہ نے حاصل کیا اور اپنی کتابوں میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ عہدِ اموی کے تاریخی حالات جاننے کا ہمارے پاس بہت بڑا ذریعہ عوانہ بھی ہے۔ عوانہ کے خیالات پر جبریت کا اثر ہے جو اس دور کے عام مصنفین کے یہاں پایا جاتا ہے۔

فتوح واخبار کے مولفین کے گروہ میں ابو مخنف کا نام خاصا اہم ہے۔[۹] اس موقع پر یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کا ہے کہ ابو مخنف سیرۃ و مغازی سے بھی تعلق رکھتا تھا اور اس نے اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ابو مخنف محمد بن اسحٰق کے ہمعصر تھے اور غالباً موخر الذکر نے ان کی کتابوں کو دیکھا بھی تھا۔ کیونکہ یاقوت الحموی نے لکھا ہے کہ محمد بن اسحٰق کا کہنا ہے، ابو مخنف کی کتابوں میں سے ایک کتاب "کتاب الردۃ" بھی ہے! اسی طرح یہ بھی ممکن ہے ابو مخنف نے محمد بن اسحٰق کی مغازی سے بھی استفادہ کیا ہو۔

ابو مخنف کی شہرت اور اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ فتوح واحداث کا زبردست عالم تھا۔ اس نے عراق کے حالات، احداث اور فتوحات پر کئی کتابیں تالیف کی تھیں۔ اس کو اس علاقے کی تاریخ کا نہ صرف

Marfat.com

وسیع علم تھا بلکہ ہمعصر واقعات پر وہ خصوصی طور پر نگاہ رکھتا تھا۔ ابن ندیم لکھتا ہے "ابومخنف عراق کے امور، اخبار اور فتوحات پر وسیع معلومات رکھتا تھا۔ مدائنی کو خراسان، ہند اور فارس کی تواریخ کا زیادہ علم تھا۔ اور واقدی کو حجاز و سیرت نبوی سے متعلق واقعات کا اور شام کے حالات پر سب کی مشترک نظر تھی!!" ابن ندیم کے اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان مورخین نے اپنے اپنے ذوق، موافق حالات کے مطابق اپنے لیے میدان بھی منتخب کر لیے۔ ابن ندیم کی یہ راے مبالغے پر محمول نہیں کی جا سکتی کیونکہ خود اس نے اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ابومخنف کی ان ۳۲ کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کو لکھنے یا تالیف کرنے کا فخر اس کو حاصل ہے۔

ابومخنف نے صدرِ اسلام کے ان تاریخی حوادث پر بھی قلم اُٹھایا تھا، اور کتابیں تالیف کی تھیں جنھیں سیاسی سطح پر تاریخ اسلام میں بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ ہماری محرومی ہے کہ اس کی کوئی ایک کتاب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ البتہ ان کتابوں کے تفصیلی ٹکڑے بلاذری اور ابن جریر الطبری نے اپنی کتابوں میں نقل کر کے مکمل طور پر ضائع ہونے سے بچایا۔ طبری نے فتح عراق اور بعد میں ہونے والی جنگوں کی تفصیلات کے لیے ابومخنف کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابومخنف نے بڑی محنت سے ان واقعات کی تفصیلات کو معتبر ذرائع سے معلوم کیا تھا۔ زبانی طریقے کے علاوہ اس نے سرکاری مسودات اور معاہدوں کے ریکارڈ حاصل کر کے انھیں اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ ایسے مسودات کے نمونے ہمیں تاریخِ طبری میں مل جاتے ہیں[۱۲]۔ ابومخنف کی بیشتر معلومات قابل اعتبار اس لیے بھی ہیں کہ اس نے وہ معلومات معتبر ذریعے سے حاصل کی تھیں۔ مثلاً جنگ صفین کے حالات قبیلۂ ازد سے معلوم

Marfat.com

کیے جس سے خود اس کا تعلق تھا اور اس جنگ میں اس کے اپنے اجداد بھی شریک تھے۔ اس نے صرف اپنے ہی قبیلے کے لوگوں سے یہ معلومات حاصل نہیں کیں بلکہ دوسرے قبیلے کے لوگوں سے بھی مل کر ان سے استفادہ کیا مثلاً بنوطئی، بنوتمیم اور بنوکندہ وغیرہ بھی اس کی معلومات کے ماخذ ہیں یہ قبائل خلفاء راشدین اور بعد کے دور میں نہایت ہی اہم سیاسی کارناموں میں شریک وسہیم رہتے ہیں۔ ان کے سردار واقعات وحوادث کی تہہ میں کارفرما عوامل کے ساتھ ساتھ اندرونی نقشہ کار سے بھی واقف ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے ذریعہ جو بھی معلومات دوسروں کو پہنچی وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بہت وزن رکھتی ہیں۔ ابومخنف انھیں میں کا ایک فرد تھا اس لیے اس کو ان واقعات کو تفصیل سے جاننے کا موقع ملا۔ ان ذرائع کے علاوہ ابومخنف نے کوفہ کے دیگر ممتاز علماء اور عالی نسب خاندان کے لیڈروں سے تحقیق حال کے لیے رابطہ پیدا کیا۔

یہ صحیح ہے کہ ابومخنف کی معلومات پر مقامیت کا رنگ غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے کے حالات تفصیل سے اس نے مرتب کیے جہاں وہ مقیم تھا یعنی عراق اور اس کے مرکز کوفہ۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عراق و کوفہ اموی خاندان کے مخالف کیمپ میں شامل تھے اور یہیں سے ان کے خلاف باغیانہ تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نوعیت کی روایات ابومخنف کے یہاں زیادہ ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر مستورد اور شبیب کی رہنمائی میں شیعوں اور خوارج کی بغاوت، اسی طرح حجر، حضرت حسین، سلیمان اور مختار کی سیاسی اور مسلح سرگرمیاں یہیں سے ابھریں۔ عراقیوں کی بغاوتیں اور ابن الاشعث کی زبردست

بغاوت اسی خاک سے اٹھی۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ ایک مورخ ان موضوعات سے دلچسپی لے۔ چنانچہ ابو مخنف نے بڑی تفصیل سے ان وقائع کو قلم بند کیا ہے۔ طبری نے ابو مخنف کے بیانات کو مستند سمجھ کر انھیں اپنی تاریخ میں تفصیل سے جگہ دی ہے۔ اس نے ابو مخنف کی آخری روایت ۱۳۲ھ کے حوادث کے تحت نقل کی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابو مخنف نے بنی امیہ کا زوال بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

چونکہ ابو مخنف کے اجداد علوی کیمپ میں شامل تھے اور حضرت علی کی رہنمائی میں انھوں نے فوجی خدمات بھی انجام دی تھیں اس لیے ابو مخنف کا اس نقطۂ نظر سے متاثر ہونا بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ابو مخنف نے کسی گروہ سے ہمدردی کے تحت یا دوسرے گروہ کے خلاف غلط روایات یا انھیں توڑ مروڑ کر قلم بند کیا ہو۔ اور اس کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قصداً احتراز کیا ہو۔ ابن جریر نے ابو مخنف کے جو بیانات اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے۔ تاہم ابو مخنف کی روایات کا دوسرے اخباری علماء کے فراہم کردہ معلومات سے مقابلہ کرنا دلچسپ مطالعہ ہوگا۔ کیونکہ اس طریق مطالعہ سے ابو مخنف کی روایات کے بارے میں زیادہ صحیح اور متوازن رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

اسی دور کے ایک ممتاز عالم اور راوی ہشام بن عروۃ بن الزبیر بھی ہیں[۱۳]۔ یہ مدینے کے مشہور محدث اور جلیل القدر خانوادے کے نامور فرزند تھے۔ ہشام حدیث و مغازی کے عالم تو تھے ہی، صدر اسلام کے احداث

Marfat.com

پر بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ انہوں نے اپنے باپ عروۃ بن الزبیر، چچا معصب بن الزبیر اور خاندان کے دیگر افراد سے واقعات معلوم کیے تھے، وہ عراق گئے اور کوفہ و بصرہ میں بھی قیام کیا۔

ہشام علماء کوفہ کو مدنی روایات کی تعلیم دیتے تھے اس لیے یہ روایات علماء کوفہ تک انہیں کے ذریعہ پہنچی تھیں۔ ان کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر بغیر سند کے بیان کرتے تھے۔ کیونکہ سند میں ان کے باپ کے علاوہ کوئی اور شخص نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی علمی میراث کو محفوظ رکھتے تھے۔ ہشام کی روایات تاریخ طبری میں ۴۳ جگہوں پر درج ہیں[۱۴]۔ ان روایات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سیرۃ نبوی و احداث اسلامی کے علاوہ کسی اور موضوع سے تعلق نہیں رکھتیں۔ روۃ اور صدر اسلام سے متعلق بعض روایات ان کے یہاں ملتی ہیں۔ طبری نے ہشام کی جو آخری روایت نقل کی ہے وہ معرکۂ مرج راھط سے متعلق ہے[۱۵]۔ ہشام کی روایات اور ان کی صحت کے بارے میں عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہشام کے ایک ہم عصر اور مشہور اخباری کا نام سامنے آتا ہے وہ ہیں سیف بن عمر الاسدی التمیمی[۱۶]۔ سیف کو فتوح و احداث کے موضوع سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس نے اس مضمون پر معلومات کا بڑا وسیع ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا اور انہیں رسالوں اور کتابچوں کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ اس کی بعض خصوصیات کی بنا پر اسے بڑی شہرت ہوئی اور لوگوں نے اس کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سیف ابن عمر قبیلۂ تمیم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے نے صدر اسلام

Marfat.com

کے اہم حادثات میں براہ راست حصّہ لیا تھا۔ اس قبیلے کے بڑے بڑے سرداران جنگوں میں شریک رہے ہیں۔ نیز انہیں سیاسی و مذہبی نوعیت کے اونچے عہدے بھی حاصل تھے، اس لیے سیف بن عمر کو صحیح حالات جاننے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

سیف نے جنگ جمل کے واقعات اپنے قبیلے کے افراد سے معلوم کیے تھے۔ کیونکہ اس قبیلے کے متعدد افراد اس جنگ میں شریک تھے اور انہوں نے احوال جنگ کا معائنہ اور اس کا قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ سیف نے زیادہ تر روایات ایسے ہی لوگوں سے حاصل کی تھیں جو اس واقعہ کے یا تو چشم دید گواہ تھے یا ایسے لوگوں سے سنا تھا جن کے سامنے وہ واقعات وقوع پذیر ہوتے تھے۔

سیف نے ردۃ اور فتوح کے موضوع پر کئی رسالے مرتب کیے ہیں۔ ابن ندیم نے اس کی کتاب "کتاب الفتوح الکبیر والردۃ" کا ذکر کیا ہے[۱]۔ اس کتاب کو ابن حجر عسقلانی نے پڑھا تھا اور ذہبی نے اس کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیف کی یہ کتاب عرصہ تک موجود تھی۔ اس کی دوسری کتاب "کتاب الجمل وسیر عائشہ و علی" تھی، پہلی کتاب میں غالباً صدر اسلام کے فتوحات، ارتداد کے واقعات اور صحابہ کی خانہ جنگیوں کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ سیف کی یہ دونوں کتابیں ناپید ہیں البتہ ان کے متعدد ٹکڑے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، بالخصوص تاریخ کی مشہور کتاب تاریخ الرسل والملوک میں سیف کی متعدد کتابوں سے واقعات نقل کئے گئے ہیں، چنانچہ طبری نے جنگ جمل کا واقعہ سیف کی کتاب سے نقل کیا ہے اور سیف نے اس حادثہ کا حال ان لوگوں سے سنا تھا جو اس جنگ

Marfat.com

میں بنفس نفیس شریک تھے۔ ان روایات کو پڑھ کر ان لوگوں کی سند ہمارے سامنے آجاتی ہے جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ ان روایات کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے جس سے صرف واقعہ کی تصویر ہی سامنے نہیں آتی بلکہ ان کے ذریعے ان اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس واقعہ کا سبب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ ان روایات کی ایک ایک کڑی صحیح ہے اور ان پر تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وثوق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ان روایات کو سامنے رکھ کر اسی واقعہ سے متعلق دوسرے راویوں کے بیانات کا تقابل اور تنقیدی مطالعہ کیا جائے۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ سیف نے اس حادثے کے بارے میں ان بیانات کا جوں کا توں تسلیم کر لیا ہو، جو اس کے اپنے قبیلے والوں نے فراہم کی تھیں، اس امکان کو بروکلمان نے بھی تسلیم کیا ہے[۲]۔ اس کا مزید خیال یہ ہے کہ سیف اپنے قبیلے کی برتری میں مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ سیف کی اسی کمزوری کی وجہ سے طبری نے ان روایات کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے۔ مگر اس رائے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ طبری نے ردۃ کے موضوع پر سیف کی روایات کو نقل کیا ہے۔ اگر سیف کی روایات کمزور تھیں تو اتنے اہم موضوع پر دیگر مولفین کو نظر انداز کر کے طبری صرف سیف ہی کی روایات کو کیوں ترجیح دیتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ جمل کے موضوع پر متعدد باا ثر مورخین نے رسالے مرتب کیے تھے بالخصوص ابو مخنف نے۔ آخر طبری نے ان سب کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی سیف کی روایات کو کیوں مستند تسلیم کیا ہے۔ طبری کے اس ترجیحی رد یے کی آخر کوئی تاویل بھی ہونی چاہیے۔ تاریخ طبری میں سیف کا نام تین سو سے زیادہ مواقع پر آیا ہے پہلی بار ۱۱ھ کے حوادث میں، واضح ہو کہ اسی سال مسیلمۃ الکذاب

Marfat.com

نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور آخری بار اس کا نام ۳۶ھ کے حوادث کے تحت آیا ہے۔ یہ روایت اس موقع کی ہے جب حضرت علی جنگ صفین میں شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے، اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طبری کو ردۃ اور جنگ جمل و صفین جیسے اہم اور نازک موضوعات پر سیف پر کتنا اعتماد تھا۔ اس لیے کھل کر تفصیل سے اس کی روایات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ ان مواقع کے علاوہ بھی طبری نے سیف کی روایات کو نقل کیا ہے۔ وہ فتوحات جو حضرت عثمان کے عہد میں ہوئیں ان پر طبری نے سیف کی روایات پر بھروسہ کیا ہے۔

سیف بن عمر نے بڑی دیدہ ریزی سے احداث اسلامی پر معلومات کا وسیع خزانہ اکٹھا کیا تھا، اس کا یہ کارنامہ فن تاریخ نگاری کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ بعد میں آنے والے مورخین نے اس کی کتابوں سے استفادہ کیا اور وہ زمانے کی دست و برد سے محفوظ ہو کر ہم تک پہنچ سکیں۔ سیف کے بعد تیسری صدی کی ابتداء میں اخباریوں کا ایک اور گروہ سامنے آتا ہے جس میں نصر بن مزاحم، مدائینی، ہشام الکلبی اور ہیثم بن عدی وغیرہ شامل ہیں۔ نصر بن مزاحم اور مدائینی تو خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔

نصر بن مزاحم اپنے عہد کا مشہور اخباری گزرا ہے[۲۱]۔ یہ کوفہ کا رہنے والا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شیعی عقیدے کا مسلمان تھا[۲۲]۔ اس لیے بظاہر اس کی دلچسپی ان موضوعات سے تھی جو براہِ راست اس گروہ کے لیے اہمیت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر جنگ جمل، مقتل حسین، مقتل حجر بن عدی اور مختار وغیرہ۔ ان موضوعات پر نصر نے رسالے تصنیف کیے تھے[۲۳]۔ ابن ندیم نے اس کی جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر ضائع ہو گئیں صرف کتاب الصفین

Marfat.com

موجود ہے جو چھپ بھی گئی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر نصر کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ درحقیقت اپنے مذہبی میلانات سے بلند ہو کر تاریخی واقعات کے انتخاب میں اس نے اپنی قوت تمیز کو استعمال نہیں کیا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایسی روایات نقل کی ہیں جو معاویہ کے خلاف اور اس کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں۔ لیکن صرف اتنی سی بات یہ رائے قائم کرنے کے لیے بہت زیادہ وزن نہیں رکھتی کہ وہ روایات گڑھا کرتا تھا۔ ضرورت ہے کہ نصر کی روایات کو چھانٹ کر اس موضوع پر دیگر مؤلفین کی روایات سے تقابلی مطالعہ کیا جائے، پھر اس کے بعد جو رائے قائم ہوگی اس میں زیادہ وزن ہوگا۔ تاہم اتنا تو بہر حال تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ نصر بن مزاحم نے اپنی تالیفات کے ذریعے عرب تاریخ نگاری کی سرگرمیوں کو تقویت پہنچائی اور ان سے واقعات پر نئی روشنی پڑی۔

اس موقع پر ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ اخبار و احداث کے ادب کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی آزاد اور مستقل حیثیت تھی۔ یعنی ہر مؤلف کسی خاص اہم واقعہ کو اپنا موضوع بناتا تھا اور پھر اس واقعہ کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اس موضوع پر سارے مواد کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے اس عمل میں اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ ان معلومات کو ایسے شخص سے حاصل کیا جائے جو اس مخصوص واقعہ سے براہِ راست متعلق رہا ہو، اس نے اس میں شرکت کی ہو یا ایسے آدمی سے سنا ہو جو اس میں شریک رہا ہو یا اس نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو۔ ان مؤلفین احداث کے ساتھ زیادہ تر یہی دونوں صورتیں پیش آئی ہیں۔ ان لوگوں نے ہر ہر واقعہ پر مستقل رسالہ تصنیف کیا۔ اس طرح صدر اسلام

Marfat.com

میں واقعہ ہونے والے ہر اہم واقعہ پر خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو کتابیں لکھی گئیں جن کی تعداد واضح طور پر بہت زیادہ تھی۔

مذکورہ مؤلفین اخبار کی معلومات کو چھان بین، تجزیہ و تنقید کر کے اس مواد کو از سر نو مرتب کرنے والا ایک نامور اخباری اور مورخ مدائنی گزرا ہے[24]۔ مدائنی نے اپنے پیش رو تمام اخباریوں کی کتابیں تلاش کر کے حاصل کیں۔ تنقید و تصحیح کے بعد اس مواد کو اپنی کتابوں میں نقل کیا۔ اس نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ سیرۃ و مغازی سے لے کر عباسیوں کی تاریخ تک اس کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس طرح اس نے درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔ ابن ندیم نے مدائنی کی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان کی تعداد دو سو پینتالیس[245] تک پہنچی ہے[25]۔

مدائنی اگرچہ بصری تھا اور اس کی تمام تر علمی نشو و نما عراقی مکتب فکر کے ماحول میں ہوئی تھی جس کی ایک اہم خصوصیت اسناد کی طرف سے بے توجہی تھی ہے۔ چنانچہ وہ تمام اخباری اور مورخ جنہوں نے اپنا رشتہ عراقی مکتب فکر سے جوڑا اور جو کوفہ کے مسند علم پر فائز ہوئے اور جنہوں نے اپنی بے مثال کوشش سے صدر اسلام کے تمام حوادث کے بارے میں معلومات کو تلاش کیا اور انہیں اکٹھا کر کے کتابی شکل میں منضبط کیا وہ سب اسناد کی پابندی میں بے توجہی سے کام لیتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مدائنی نے اپنے تمام پیش رو علماء کے برخلاف تلاش و تحقیق کے ساتھ اسناد کی پابندی پر زور دیا۔ اپنی تنقیدی بصیرت استعمال کر کے واقعات کے سند کی چھان بین کے ذریعے ہر ایک راوی کو پرکھا اور اسے احتساب کی کسوٹی پر آزمایا۔ تب جا کر ان کی روایات کو قبول کیا۔ اس اعتبار سے مدائنی کا کارنامہ خاصا اہم ہے کہ اس

Marfat.com

نے تاریخی ادب کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا۔ یہ کام اس کے پیش رو نہ کر سکے تھے۔
اس وجہ سے عام طور پر یہ رائے تسلیم کی جاتی ہے کہ مدائنی ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا اور اس کی کتابیں زیادہ قابلِ اعتماد اور صحت سے قریب تر ہیں۔
مدائنی نے خوارج کے پس منظر میں بصرہ کے واقعات کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دیگر حوادث اور خراسان کی تاریخ پر قیمتی اور گہری واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ متعدد علاقوں اور موضوعات کے بارے میں مدائنی کی وسیع معلومات کو آنے والے مورخین نے مستند تسلیم کیا ہے۔ بالخصوص طبری نے بصرہ اور ماوراء النہر کی تواریخ کے تمام تر واقعات مدائنی کی کتابوں سے اخذ کی ہیں۔ یہ بات مدائنی کی ثقاہت اور اس کی علمی برتری کے لیے بڑا وزن رکھتی ہے۔ مدائنی نے ایک کتاب "کتاب اخبار الخلفاء الکبیر"، تصنیف کی تھی جس کے بارے میں یہ رائے ہے کہ وہ بہت ضخیم تھی۔ اس کتاب میں عہد معتصم تک کے حالات درج تھے۔ طبری نے ہشام کے دور حکومت ۱۲۵ھ سے لے کر ولید کے عہد حکومت تک کے حالات بظاہر اسی کتاب سے نقل کیے ہیں۔
اگرچہ عہد اموی کی تاریخ کے لیے طبری عام طور پر ابو مخنف کو ترجیح دیتا ہے۔ مدائنی کی ایک اور کتاب "کتاب الدولۃ العباسیہ"، ہے۔ اس زمانے میں بلکہ اس سے پہلے بھی خاندانی تاریخ لکھی جانے لگی تھی۔ یہ کتاب متعدد رسائل کے مجموعے پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض حصّہ یاقوت الحموی کو سکیریا مخطوطات کے ذخیرے میں ملا تھا۔ مدائنی کی ایک اور کتاب تاریخ خراسان تھی اس کا نام ابن ندیم "کتاب فتوح خراسان"، لکھتا ہے[۲۶] یہ کتاب وسط ایشیا میں مسلم فتوحات کے موضوع پر نہایت ہی قیمتی کتاب تھی۔ ابن جریر الطبری نے اس کتاب کو تفصیل سے نقل کیا ہے۔ مدائنی کی ایک اور کتاب "تاریخ بصرۃ"، تھی۔

Marfat.com

یہ کتاب بھی طبری کے لیے اہم ماخذ کے طور پر کام آئی۔ غالباً اس نے یہ کتاب عمر بن شبہ کے ذریعہ حاصل کی تھی۔ مداینی کی وہ کتابیں جو خوارج سے متعلق ہیں انہیں نہ صرف یہ کہ طبری نے استعمال کیا بلکہ ان سے بلاذری نے بھی اپنی "انساب الاشراف" میں اصفہانی نے "کتاب الاغانی" میں اور ابن الاثیر نے تاریخ الکامل میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔

مداینی کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی مخصوص مکتب فکر کا نمائندہ نہیں ہوسکا۔ کیونکہ اس نے مواد کے انتخاب میں توازن و اعتدال کے ساتھ انتخابی رویہ اپنایا تھا۔ مثال کے طور پر مدنی مکتب فکر کی ایک خصوصیت سند کی پابندی ہے، چنانچہ مداینی بھی اس روایت کو اپنے یہاں پابندی سے برتتا ہے، نیز اس کیساتھ واقعات کی صحت کو بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے کیونکہ کسی واقعہ کے مستند ہونے کے لیے محض سلسلۂ سند کی پابندی اور اس کی تحقیق ہی ضروری نہیں۔ اس لیے ہم بڑے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مداینی نے روایات کی صحت کو پرکھنے میں پوری توجہ سے کام لیا ہے۔

کسی مورخ کا اپنے دور کے سماجی و معاشرتی رشتوں سے بلند ہو کر تاریخی واقعات کا معروضی طور پر تجزیہ کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان اسباب میں اگر معاشی اور سیاسی رشتوں کا اور اضافہ کر دیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ وہ واقعات کو ایک غیر متعصب کی نگاہ سے دیکھنے میں خاصی دشواری محسوس کرے گا۔ میں نے اس نکتے کی طرف اس لیے اشارہ کیا ہے کہ مداینی انہیں حالات سے دوچار تھا۔ وہ بغداد میں رہ کر خلفاء وقت کی نوازشوں اور وزراء کی عنایتوں سے بہرہ یاب ہو کر اس کے نفسیاتی اثرات سے کیسے بچ سکتا تھا۔ اس لیے اگر لوگوں کا یہ خیال ہو کہ وہ عباسی خلفاء

Marfat.com

سے عقیدت رکھتا تھا چنانچہ تاریخی واقعات کے انتخاب میں اگر اس نفسیاتی اثر کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو یہ بعید از قیاس نہیں ہے۔ غالباً اسی بنا پر ولہاوزن نے لکھا ہے کہ "مدائنی مکمل طور پر عباسی تھا اور اسی نقطۂ نظر سے وہ بنی امیہ کے زوال اور بنی عباس کے عروج کو بیان کرتا ہے" اس رائے میں کہاں تک صحت ہے اور اس پر کہاں تک زور دیا جا سکتا ہے، اس پر تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کی ضرورت ہے، تاہم یہ عجیب بات ہے کہ مدائنی کی کتابیں اپنے دور کی مستند ترین کتابیں سمجھی جاتی تھیں اور بیشتر مورخین نے ثقہ سمجھ کر ان سے واقعات نقل کیے ہیں۔ مذکورہ رائے کی تصدیق و تردید کے لیے ان روایات کا تقابلی مطالعہ کرنا ضروری ہے جنہیں شامی علماء نے منضبط کیا تھا۔ دوسری و تیسری صدی کے ان اخباریوں کی ثقاہت کو متعین کرنے کی راہ میں طویل معروضی مطالعے کی ضرورت ہے۔

اخبار و فتوح کے موضوع پر کام کرنے والوں اور ان پر کتابیں تالیف کرنے والوں نے عرب تاریخ نگاری کی ارتقا پر بڑے احسانات کیے ہیں۔ اس گروہ کے علاوہ علماء کا ایک اور گروہ بھی ہے جس نے اس فن کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انہیں ہم علماء انساب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی تفصیلی سرگرمیوں نے تاریخ نگاری کے فن کو نئے اور ضروری مواد سے آشنا کیا ہے۔

عربوں کے جذبات و احساسات میں ایک اہم اور قومی جذبہ نسب و حسب کا گہرا احساس تھا۔ وہ اس پر فخر کرتے اور اس کی حفاظت کے لیے سخت اہتمام کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے نسبی عصبیت کا کافی زور تھا۔

عربوں کے جذبات و احساسات پر نسب و حسب کے خیال کی مضبوط

Marfat.com

گرفت رہی ہے ۔ وہ اپنے عالی خاندان وعالی نسب ہونے پر بہت فخر کرتے اور شجرۂ نسب کی حفاظت کے لیے بہت اہتمام بھی کرتے تھے ۔ اسلام سے پہلے یہ نسبی عصبیت کافی زوروں پر تھی ۔ معاشی ، معاشرتی اور مذہبی خیالات پر اس عصبیت کا بڑا اثر ہوتا تھا ۔ اس احساس کے ذریعہ قبائل کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بعض مسائل کو حل کرنے میں مدد بھی ملتی تھی۔

جب اسلام آیا تو اس نے اس اہم عامل کو دبا دینے کی پوری اخلاقی کوشش کی ۔ چنانچہ آنحضرت نے اپنی تعلیمات اور اپنے عمل کے ذریعے اس کے اثرات کو کمزور کرنے کی بھرپور جدوجہد کی جس میں عارضی طور پر تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی ۔ لیکن یہ کامیابی عارضی تھی ۔ یہ تو ہوا کہ آپ کی زندگی میں صحابہ نے کوئی کام نہیں کیا جس سے نسبی غرور کی بو آتی ہو تاہم آپ کی وفات کے بعد ہی یہ دبی ہوئی ، صلاحیت پھر ابھر آئی ، جسے آنحضرت کے دو جانشینوں نے اپنی بے لوث ، سچی ، اور منصفانہ طبیعت کی قوت سے قابو میں رکھا ۔ یہ لوگ اسلام کے نظام اخوت و مساوات کی روح کے سچے علمبردار تھے ۔ لیکن تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے نسب کی اہمیت کو دوبارہ ابھار دیا ۔ چنانچہ عرصہ تک عربوں کی ہیئت اجتماعیہ میں یہ قوت دبی ہوئی نہیں رہ سکی ۔ نئے نئے ممالک کی فتح ، سرسبز و شاداب زمینوں کی ملکیت اور اس کو تقسیم کا مسئلہ ، ابھرتے ہوئے نئے نئے شہر اور ان کو آباد کرنے کا معاملہ ، حکومت کے اعلےٰ مناصب پر فائز ہونے کی توقع ، اعلےٰ فوجی کارناموں کی تکمیل میں اونچے عہدوں کی لالچ ۔ اور اس طرح کے دیگر مسائل سامنے آئے ۔ غلاموں کی کثرت اور آبادکاری کے نتیجے میں عرب نوجوانوں سے سابقے نے بھی ہر سطح پر عرب عصبیت کو مجموعی طور پر ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا ۔ ایران ، شام ، مصر اور دیگر مفتوحہ ممالک کے غلاموں اور دہاں

Marfat.com

کے اعلیٰ طبقے سے سابقے کے نتیجے میں عربوں کے نسبی جذبہ برتری کو تقویت پہنچی۔ خلافت بنی امیہ نے بھی اپنے سیاسی مفاد کی خاطر براہ راست یا بالواسطہ اس جذبۂ عصبیت کو تقویت پہنچائی۔ اس رد یئے کے پیچھے سب سے بڑا محرک یہ تھا کہ نئے حالات میں عجمیوں کے مقابلے میں عربوں کو اعلیٰ سماجی مقام حاصل کرنے میں مدد مل سکے۔ اس ہمت افزائی کا ایک برا اثر یہ ہوا کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں عرب و عجم کی نسلی کشاکش نہ پیدا ہوئی ہو۔ جہاں اور بہت سے معاشرتی ادارے اس سے متاثر ہوئے رہیں علمی میدان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کئی تہذیبی تحریکات ایسی ابھریں جو اس عصبیت کو تیز کرنے میں اہم رول ادا کرتی رہیں۔ ان میں سے شعوبیہ کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک نے اس عصبیت کو بڑھاوا دیا۔[۲۸] اس کے ردعمل میں عربوں کے اس جذبے کو اور تقویت پہنچی۔ انھیں اپنے ماضی و حال کے کارناموں کو ضبط تحریر میں لانے اور علمی سطح پر علوم کی تنظیم و ترقی میں اس سے تحریک ملی۔ ماضی سے دلچسپی لینے کی ایک صورت تو یہ ہوئی کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے کارناموں کو لکھنے کی جانب مائل ہوئے۔ اس وجہ سے فن انساب کی اہمیت ہوئی اور اس موضوع پر مواد جمع کیا جانے لگا۔ یہ مواد علم سینہ کی حیثیت سے موجود تھا، کیونکہ اکثر قبائل اپنے نسبی معلومات کو حافظے کی مدد سے یاد رکھتے تھے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جو دوسرے قبائل کی نسبی شاخوں کو بھی یاد کر لیتے تھے تاکہ اپنے قابلِ فخر پہلوؤں کو جان سکیں اور فخر و مباہات کے موقع پر اس کا ذکر کر کے اپنے احساس خودی کو تسکین دے سکیں۔

عہد اموی میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی اسباب کی بنا پر جن کی طرف

Marfat.com

اشارہ ہو چکا ہے دوبارہ پوری قوت کے ساتھ اس جذبۂ نسبیت کو ابھرنے کا موقع ملا۔ جس کے نتیجے میں انساب کا فن باقاعدہ طور پر وجود میں آیا۔ کیونکہ اس فن کی مدد سے مفتوحہ اراضی کی تقسیم، مال غنیمت کی تقسیم اور وظائف کی تقسیم ممکن ہو سکی۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی کی ابتداء میں انساب کا مواد باقاعدہ مرتب کیا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس موضوع پر وسیع لٹریچر تیار ہو گیا۔ اس لٹریچر کی مدد سے تاریخ نگاری کے فن کو بڑا مواد ملا۔

عہد جاہلی میں عربوں نے انساب کے مواد کو اپنی شاعری میں بھی محفوظ کر دیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لکھائی کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا اور کسی ذہنی و تہذیبی میراث کو محفوظ کرنے کا بڑا ذریعہ حافظہ ہی تھا شعر آسانی سے یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے شعراء نے انساب کے مواد کو قصداً یا غیر شعوری طور پر شعر میں نظم کیا۔ اس کے علاوہ ایک شکل یہ بھی تھی کہ نظم سے پہلے اس نظم کے غامض و مبہم پہلوؤں اور مواقع کی تشریح کے لیے ابتداء میں ایک حصّہ نثر کا بھی ہوتا تھا۔ پورے نظم میں اس کی حیثیت ایک تمہیدی رپورٹ کی ہو جاتی تھی۔ یہ حصّہ بھی ان لوگوں کے کام آیا جو تاریخ کے موضوع سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کو خصوصی توجہ اور بڑی محنت سے حاصل کیا۔ اسطرح کے علماء کی پہلی جماعت میں الویقظان، محمد بن سائب الکلبی، ہشام بن محمد الکلبی، معصب بن زبیر اور ہشیم بن عدی کے اسماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

الویقظان کا انتقال ۱۹۰ھ میں ہوا[۲۹]۔ لیکن اس کی سنہ پیدائش کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس نے فن انساب پر کئی رسالے تصنیف کیے تھے جو سب ضائع ہو گئے۔ البتہ ان کتابوں کے بعض حصّے مورخین کے

یہاں ملتے ہیں۔ ابو الیقظان کے بعد محمد بن سائب الکلبی نے اس فن میں اپنی تصنیفوں کے ذریعے اضافہ کیا۔

محمد بن سائب الکلبی فن انساب واخبار کا زبردست عالم گزرا ہے[۳۰]۔ اس نے انساب کی معلومات حاصل کرنے کے لیے بڑی مشقت اور محنت سے کام کیا۔ اس مقصد سے وہ ہر قبیلے کے ایسے لوگوں سے ملتا تھا جو اپنے قبیلے کے نسب سے پوری طرح باخبر اور معتبر تھے۔ وہ ایک قبیلے کے حالات دوسرے قبیلے کے لوگوں سے نہیں معلوم کرتا تھا۔ کیونکہ اس صورت میں شبہ کا امکان ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنی اس سرگرمی کے باوجود شاید محمد نے اپنی معلومات کو کسی کتاب میں جمع نہیں کیا۔ کیونکہ ابن ندیم نے اس موضوع پر اس کی کسی کتاب کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے چند رسالے لکھے بھی ہوں جو ابن ندیم تک نہ پہنچے ہوں۔ البتہ اس کی ایک کتاب "تفسیر القرآن" کا ذکر آتا ہے[۳۱]۔ لیکن اس کتاب کو بھی عام طور پر علماء شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اس کے بیٹے ہشام نے اپنے باپ کی ان معلومات کو جو اسے فن نسب پر حاصل تھیں، بعد میں کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔

ہشام بن محمد بن سائب الکلبی اپنی گوناگوں دلچسپیوں کی بنا پر تاریخ اسلام میں بڑی شہرت کا حامل ہے[۳۲]!

ہشام تحصیل علم کے لیے دور دراز مقامات کا سفر بھی کرتا تھا۔ وہ ان کنائس و دیلور کی بھی زیارت کرتا جہاں کوئی علمی خزانہ موجود ہوتا۔ چنانچہ اسے اس خزانے سے استفادے کا موقع بھی ملتا تھا۔ وہ اس مقصد کے لیے عراق و یمن کا سفر بھی کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقامات کی تاریخ پر اس کی اچھی نظر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حیرۃ کے کنائس میں پہنچ کر اس نے مخطوطات کو ملاحظہ

Marfat.com

کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن الکلبی نے اس مقصد کے لیے پہلوی زبان بھی سیکھی ہو۔ غالباً اس کی اسی تحقیقی سرگرمی کی بنا پر ان معلومات کو جو اس نے فراہم کی ہیں قابل وثوق تسلیم کیا گیا ہے۔

عہد اسلام سے پہلے کی عرب تاریخ کے بارے میں بھی ابن الکلبی نے بڑی دیدہ ریزی سے معلومات کو جمع کیا اور انہیں اپنے رسائل میں تحریر کیا تھا۔ اس کی ان معلومات کا اعتراف ابن ندیم[۳۳]، ابن الخطیب[۳۴]، یاقوت الحموی[۳۵] اور ابن خلکان[۳۶] نے کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہشام نے قبل اسلام کے عہد پر درجنوں کتابیں تالیف کی تھیں۔ چنانچہ اس کی دلچسپیوں کی وسعت اور کتابوں کی تعداد اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم ایک نظر ان موضوعات کے تنوع پر ڈالتے ہیں جن پر اس نے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کو دیکھ کر ابن ہشام کی ان معلومات اور وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے جو اسے عربوں کی تاریخ پر تھی۔ ابن ندیم نے اس کی کتابوں کی ایک طویل فہرست پیش کی ہے جن کی تعداد ڈیڑھ سو تک بتائی جاتی ہے۔ اس کی اکثر کتابیں ابن خلکان کے عہد تک موجود تھیں۔ کیونکہ ابن خلکان لکھتا ہے "ابن الکلبی کی ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں سے مشہور کتاب " الجمهرة " ہے جو سب سے زیادہ بہتر اور مفید ہے۔ اس کی ایک اور کتاب " کتاب المنزل " بھی ہے جو اسی قبیل کی ہے مگر یہ جمهرة سے بڑی ہے[۳۷]۔ ایام کے موضوع پر دیگر مورخین کے علاوہ ابن الاثیر نے بھی اس کی کتاب " کتاب الکلب " سے استفادہ کیا ہے[۳۸]۔ اس کا ثبوت وہ حوالہ ہے جو اس نے اپنی تاریخ میں دیا ہے۔ اسی لیے یہ بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنی کتاب " کتاب اللباب "، جو کتاب الانساب کی تلخیص ہے میں ابن الکلبی کی کتاب الجمهرة اور دوسری کتابوں کو استعمال کیا ہو۔

Marfat.com

ابن الکلبی نے ایران کی تاریخ سے دلچسپی لی اور اس موضوع پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ بالخصوص تاریخ ایران کے اس دور کے بارے میں جس کا رشتہ براہ راست عراق و یمن کے عربوں سے تھا۔ ابن ندیم نے ایسی کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں جنہیں اس نے دیکھا اور جن کا مطالعہ کیا تھا۔ مثلاً کتاب خبر الضحاک، کتاب اخذ کسری ابن لاہن العرب، کتاب الیمن وامر السیف، کتاب ملوک الطوائف وغیرہ۔ یہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں اب موجود نہیں ہیں، لیکن طبری، ابن مسکویہ اور المقدسی کی کتابوں میں ان کے چند نمونے ملتے ہیں۔ ابن الکلبی نے رومیوں کے بارے میں ایسی روایتیں درج کی ہیں جو اسرائیلی مآخذ کا پتہ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے تاریخ فارس پر ان واقعات کو قلم بند کیا ہے جو فارس ویونان اور فارس وروم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان روایات کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو مگر ان کے مآخذ ایرانی روایات اور کتب ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ابن الکلبی کے لیے یونانی زبان اور مآخذ سے براہ راست استفادے کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے۔

ابن الکلبی نے ان ممالک کی تاریخوں سے دلچسپی لے کر اور ان پر کتابیں تالیف کر کے نہ صرف یہ کہ عرب تاریخ نگاری کے دائرے میں وسعت پیدا کی بلکہ بعد میں آنے والے ان مورخین کے لیے جنہوں نے تاریخ عالم سے دلچسپی لی ان کی راہ زیادہ آسان کر دی ہے۔ ان کے کارناموں سے عرب تاریخ نگاری کے اس رشتہ میں اور معنویت پیدا ہوئی جو اس نے تاریخ عالم سے عملی تعلق پیدا کر کے ایک موقع فراہم کیا تھا۔ اس مقصد کو ابن المقفع کے ترجموں نے اور زیادہ سہل الحصول بنا دیا۔

ابن الکلبی کو ایک خاص طبقے نے شبہ کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی

Marfat.com

ثقاہت پر تنقید اور اس کی معلومات کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ خاص طور پر محدثین کی جماعت نے اس پر کذب و دروغ بیانی سے کام لینے کا الزام لگایا ہے۔ اسی بنا پر محدثین نے ابن الکلبی کی ان معلومات کو جن کا تعلق تفسیر و حدیث سے ہے درخور اعتنا سمجھا۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ابن الکلبی نے حدیث کے مضمون سے دلچسپی نہیں لی بلکہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کوفہ میں حدیث کی روایت کرتا تھا[۳۹] یاقوت الحموی نے دار قطنی اور دیگر محدثین کے خیالات کا ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ اس کو ضعیف سمجھتے تھے[۴۰] اس لیے اس جماعت نے ابن ہشام کی ان روایات کو جن کا تعلق حدیث و تفسیر سے تھا نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف تاریخ و انساب کے موضوع پر اس کی معلومات کو قبول کرتے ہیں۔

ابن الکلبی کی ثقاہت پر جدید محققین نے بھی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر جواد علی نولدیکی کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ابن الکلبی کے خلاف جو الزامات ہیں وہ سب کی سب اور عام طور پر صحیح نہیں ہیں۔ اس نے مخطوطات اور دستاویزوں کے مطالعے میں جو رویہ اختیار کیا ہے وہ علمی اصول سے بہت قریب ہے"۔ اس کے بعد جواد علی لکھتے ہیں " میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ابن الکلبی کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ عرب ماقبل اسلام کی تاریخ پر ابن الکلبی وسیع واقفیت رکھتا تھا۔ ان خوبیوں کے باوجود اس میں کمزوری بھی نظر آتی ہے کیونکہ وہ علم کی نمائش کرتا ہے۔ تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں اس کی جو روایات ملتی ہیں وہ اگر واقعی اسی کی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ ابن الکلبی میں تنقیدی ملکہ بہت کم تھا۔ وہ منقول اور معقول میں تمیز بھی نہیں کر پاتا۔ اسرائیلیات اور پرانی

قوموں کے بارے میں اس کی یہ صلاحیت اور بھی خام نظر آتی ہے۔ ابن الکلبی بعض اوقات اہلِ کتاب کے اقوال بغیر کسی جرح و تنقید کے نقل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کتاب کے بارے میں اس کی جتنی روایات ہیں انہیں وہ توراۃ کا ٹکڑا بتاتا ہے حالانکہ ان کا توراۃ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے[۱۸]۔ لیکن میرے خیال میں اس کی زیادہ ذمہ داری ابن الکلبی یا اس کے عہد کے دوسرے مورخین پر نہیں ہے کیونکہ ان روایتوں کے راوی اس طور پر روایت ہی کرتے تھے گویا یہ براہ راست توراۃ، یا تلمود یا مدراش کا ٹکڑا ہیں۔ ان روایتوں کے راوی اکثر یہودی علماء ہوتے تھے جو قدیم زمانے سے مدینہ میں موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ علماء براہ راست توراۃ کا مطالعہ کرنے کی استعداد ہی نہ رکھتے ہوں اور یہ افسانوی ادب سے اخذ کر کے عربوں کو اس طرح سُناتے رہے ہوں گویا یہ توراۃ کا ٹکڑا ہیں، چنانچہ عرب مورخین جو کچھ سنتے تھے انہیں اسی طرح قبول بھی کر لیتے تھے۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن الکلبی نے اسرائیلیات پر جو معلومات بھی فراہم کیں وہ براہ راست توراۃ سے ماخوذ نہیں بلکہ اس کی بنیاد غالباً زبانی روایات پر ہے۔

اس کا بھی امکان ہے کہ ابن الکلبی نے اپنی علمی برتری منوانے کے لیے براہ راست توراۃ سے استفادے کا ذکر کیا ہو۔ لیکن اس کے برخلاف ابن الکلبی نے جو معلومات انساب، ایام اور تاریخ عرب کے موضوع پر پیش کی ہیں وہ کافی دیدہ ریزی کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ ان تالیفات کے ذریعے عرب تاریخ کے تاریک گوشے سامنے آئے ہیں۔ اس طرح ابن الکلبی نے اس میدان میں جو اضافہ کیا اس سے تاریخ نگاری کے کام کو زیادہ سہولت ملی۔ ابن الکلبی کے بعد معصب بن زبیر نے انساب کے مواد میں اضافہ کیا۔ جو

Marfat.com

تاریخی مواد کے طور پر سود مند ہوا۔

مصعب بن عبداللہ بن مصعب بن زبیر کی تاریخ پیدائش کے بارے میں تذکرہ نویس بالکل خاموش ہیں۔ یہ مشہور صحابی زبیر بن العوام کے گھرانے سے تھے۔ ان کو فن انساب سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ ایک کا نام "النسب الکبیر" ہے جو ناپید ہے، دوسری کا نام "نسب قریش" ہے[۴۲]۔ یہ کتاب قریش کی تمام شاخوں کا نسب نامہ ہے۔ اس کا مستند ہونا بھی عام طور پر مسلم ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مصعب نے یہ معلومات اپنے باپ اور اپنے خاندان کے دوسرے افراد سے حاصل کی تھیں۔ ان کا ایک ماخذ ابن شہاب الزہری بھی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور ماخذ کا پتہ نہیں چلتا۔

فن انساب پر کام کرنے والوں میں مصعب کے بعد ہیثم بن عدی کا ذکر آتا ہے[۴۳]۔ یہ شعر و ادب کے اچھے عالم تھے۔ اخبار، مثالب اور مآثر پر وسیع علم رکھتے تھے۔ ایران کے ساسانی عہد پر اپنی معلومات کو قلم بند بھی کیا ہے۔ لیکن انہوں نے تاریخی مواد کو انساب کے مواد سے خلط ملط کر کے دونوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا اور اپنے نسبی معلومات کو تاریخ کے لیے استعمال کیا ہے۔ ان کی کتاب "تاریخ الاشراف الکبیر" اسی انداز پر لکھی گئی تھی۔ ابن ندیم نے ان کی کئی کتابوں کا اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ ہیثم نے فقہاء مدینہ کی طبقات بھی تصنیف کی تھی۔ غالباً یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب تھی۔ اس کا نام "طبقات الفقہاء والمحدثین" تھا۔ اس نے اس کتاب کے اندر مقامی خصوصیات کی حامل معلومات کو زیادہ

Marfat.com

جگہ دی تھی، بالخصوص کوفہ و بصرہ سے متعلق ۔ ہیثم کی ایک اور کتاب بھی قابلِ توجہ ہے ۔ ابن ندیم نے اس کا عنوان "کتاب التاریخ علی السنین" رکھا تھا ۔ اس عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ ہیثم نے ترتیب سنین کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا تھا اور غالباً اس نوعیت کی یہ پہلی کتاب تھی ۔ یہ بات ہیثم کے لیے قابل فخر ہے ۔ کیونکہ اس نے تاریخی واقعات کو سن کے تعین اور ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا جو آنے والے مورخین کے لیے بطور نمونہ کام آئے ۔

ہیثم کی معلومات کو جو خاص طور پر اخبار و انساب سے متعلق ہیں انہیں مورخوں نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے ۔ مدائنی اور بلاذری نے ان سے استفادہ کیا اور انہیں کے ذریعہ طبری نے ان معلومات سے فائدہ اٹھایا ۔ اس طرح ہیثم کی کتاب کے ٹکڑے ہی بالواسطہ ہم تک پہنچ سکے ہیں ۔

انساب کے ان مؤلفین نے اپنی معلومات کے ذریعے عرب تاریخ کو اہم مواد فراہم کیا اور اپنے انسابی لٹریچر کے ذریعہ تاریخ نگاری کے کام کو تقویت پہنچائی ۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ان علماء انساب میں ایسے بھی گزرے ہیں جو صرف اسی فن سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اخبار ایام پر بھی وسیع اور گہری معلومات رکھتے تھے ۔ ان معلومات نے براہ راست عرب تاریخ نگاری کے لیے قیمتی مواد فراہم کیا ۔ انساب ، اخبار اور ایام کے مواد کا ایک دوسرے سے گہرا ربط بھی ہے ۔ انساب کا مواد حاصل کرنے کے لیے انہیں اخبار و ایام کی طرف بھی رجوع کرنا پڑتا تھا اور ناموں کی تلاش و تحقیق میں علماء ایام و اخبار مدد فراہم کرتے تھے ۔

ہیثم بن عدی کی دوستی حسن بن سہل سے خاصی گہری تھی ۔ موخر الذکر شروع میں مامون کا گورنر رہ چکا تھا آخر میں وزیر اعظم کے عہدے پر بھی

Marfat.com

فائز ہوا۔ اس کی لڑکی بوران مامون کے عقد میں تھی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حیثیت کے آدمی کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔ حسن بن سہل کا گھر اپنے دور میں علم و فن کا مرکز تھا۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء، وزراء اور شعراء اس کے گھر آنے اور اس علمی فضا سے مستفید ہونے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ ہیثم بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ حسب توقع حسن بن سہل نے ہیثم کی علمی سرگرمیوں میں اس کی ہر طرح مدد کی۔ خود ہیثم بھی منصور، مہدی، ہادی، اور رشید کے دربار میں براہ راست بے تکلفی سے آیا جایا کرتا تھا۔ اس سہولت اور مناسب حیثیت کی بنا پر صحیح اور قابلِ وثوق معلومات کو فراہم کرنے میں ہیثم کو آسانی ہوئی۔ اس کی تقریباً ۵۰ کتابوں میں سے دو کتابیں دولتِ عباسیہ پر تھیں۔ ایک کا نام "کتاب الدولۃ" اور دوسری کا نام "کتاب التاریخ"، تھا۔ ان کتابوں میں دولۃ عباسیہ کے حالات درج تھے۔ طبری نے ہیثم کو ۱۳ بار نقل کیا ہے جو زیادہ تر دولۃ بنی عباس سے متعلق ہے[۴]۔ مسعودی نے قبیلۂ طی کے بارے میں ہیثم کی کتاب "کتاب اخبار طی و نزولہا الجبلین"، سے استفادہ کیا تھا[۵]۔ اسی مسعودی نے بصرۃ کی آبادکاری کے سلسلے میں ہیثم کی روایات کو نقل کیا ہے[۶]۔ ہیثم غالباً پہلا شخص ہے جس نے خطط پر کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کی کتاب کا نام "خطط الکوفہ"، تھا[۷]۔

عرب تاریخ نگاری کو لغت سے بھی مواد حاصل ہوا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ زبان کے مطالعے کی ضرورت دوسری منظم طریقوں کی طرح بہت پہلے محسوس کی جا چکی تھی۔ عربوں کا جب اہلِ عجم سے اختلاط ہوا اور اسلامی ملکوں میں ابھرتے ہوئے نئے نئے شہروں میں اہلِ عجم کی کثرت ہوئی تو ان لوگوں نے

Marfat.com

حکمراں طبقے کی زبان بھی سیکھنی شروع کی۔ وہ عربی زبان سے واقفیت پہنچانے کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر اب مقابلے میں آ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو عربوں نے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا۔ چنانچہ اس صورت حال نے عربوں کے قوئ عقلیہ کو جگایا اور انہیں آمادۂ عمل کیا۔ عرب علماء اپنے زبان کی گرام اور اس کی تطہیر کے عمل میں مشغول ہو گئے۔ یہ ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ عرب نوجوان اور خلفاء کے لڑکے عجمیوں سے اختلاط کی بنا پر اپنی زبان بھولے جا رہے تھے۔ ان کی زبان فصحیٰ میں عجمیت کی آمیزش ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی عرب علماء لغت کی کتابوں کو لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔

لغت نے تاریخ نگاری کے فن کو کس طرح نوازا اس کی صورت یہ ہوئی کہ لغت کے مطالعے کی بنیاد شاعری پر تھی۔ چنانچہ جب بھی زبان کے مسئلہ پر سند کا مسئلہ اٹھتا تو دیگر صورتوں کے علاوہ شعراء کے کلام سے استشہاد کیا جاتا تھا۔ عرب بدوؤں کے پاس اشعار کا وسیع ذخیرہ ہوتا تھا اور زیادہ تر نظمیں ایسی تمہیدی نثر سے شروع ہوتی تھیں جس میں ان مبہم اشارات کی تشریح ہوتی جو نظم میں پائے جاتے تھے۔ اشخاص کے ناموں اور جگہوں کے ناموں کی تفصیلات اس نظم کی تمہیدی نثر میں موجود رہتی تھیں۔ چنانچہ علماء لغت نے ان نظموں کے ساتھ ان تشریحی نوٹس کو بھی محفوظ کر لیا جو ہر نظم میں موجود ہوتے تھے۔ ان تشریحات میں انساب کی معلومات بھی ہوتی تھیں۔ اس طرح اس مواد نے تاریخ نگاری کے لیے مواد فراہم کیا۔

ان علماء لغت میں سے سب سے پہلے ابو عمر بن العلیٰ کا نام آتا ہے[۴۸]
ابن ندیم نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ابو عمر عرب اور عربیت کا سب سے بڑا عالم اور قرآن، شعر و ایام کا مشہور فاضل تھا"[۴۹] ابو عمر اگرچہ

Marfat.com

ان موضوعات سے گہری دلچسپی لیتا تھا لیکن اس کی کسی کتاب کا ذکر نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی موضوع پر کچھ لکھا ہی نہ ہو۔ تاہم اس کے ممتاز شاگرد ابو عبیدہ نے استاد کی معلومات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔

ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ الیتمی خاندان قریش کی ایک شاخ تمیم کا ایک آزاد کردہ غلام تھا۔ یہ شخص گرامر، شعر، ایام، انساب، اور مثالب کے موضوعات پر وسیع نظر رکھتا تھا اور تقریباً ہر صنف پر اس نے کتاب تصنیف کی تھی۔ ابو عبیدہ کے شوق کا یہ عالم تھا کہ معلومات مہیا کرنے کے لیے دشوار گذار مقامات کا سفر کرتا۔ ملک کے اندرونی دور دراز مقامات تک جاتا اور ہر ہر قبیلے کے معتمد لوگوں سے مل کر پوچھ پاچھ کرتا۔ اس طرح اس نے شمالی عرب کی تمام روایات و واقعات کو جمع کر لیا۔ غالباً اسی لیے ابن ندیم نے لکھا ہے کہ "ابو عبیدہ کا گھر عرب کا دیوان ہے"۔ اس سے مراد ان کی زندگی کے تمام گوشوں کے حالات خواہ ادبی ہوں یا تاریخی انہیں اس نے جمع کیا تھا۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ "ایام عرب، اخبار انساب و اشعار کا روئے زمین پر اس سے بڑا کوئی خارجی عالم نہیں ہے"۔ اس نے اپنی معلومات کو اپنی کتابوں میں منضبط کیا۔ چنانچہ ابن ندیم، یاقوت اور ابن خلکان کی روایت کے مطابق ایام عرب پر اس کی تقریباً ایک درجن کتابیں ہیں۔ ابن ندیم نے اس کی ایک کتاب "کتاب الایام" کا ذکر کیا ہے[۱۱] مگر یاقوت اور ابن خلکان نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً ان لوگوں کے دور میں یا تو یہ کتاب مفقود ہو گئی ہو یا ان تک نہ پہنچی ہو۔ اس کی دو اور کتابوں کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ ایک کا نام "کتاب ایام الکبیر" اور دوسری کا نام "کتاب ایام الاصاغر" ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کی تقریباً دو سو کتابیں فہرست میں مندرج ہیں جن میں سے چند ہی محفوظ رہ سکیں۔

ایام کے موضوع پر ابوعبیدۃ کی کتابوں کے ٹکڑے متعدد کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ طبری نے اپنی تاریخ میں تقریباً ۵۰ جگہوں پر اس کی روایات کو درج کیا ہے[۵۴] ابن الاثیر نے اپنی تاریخ کے اس حصّے میں جس کا تعلق ایام عرب سے ہے ابوعبیدۃ کی کتابوں سے نقل کیا ہے[۵۵] غالباً سیوطی نے بھی اپنی "المزہر" میں ابوعبیدۃ کی معلومات سے استفادہ کیا ہے[۵۶] اس کے علاوہ تاریخ اسلام کے کئی اور پہلوؤں پر اس نے رسالے مرتب کیے تھے۔ مثال کے طور پر خوارج، فقہاء اسلام اور موالیوں پر اس کی تصنیفات بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ لیکن ابوعبیدۃ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ رسائل اور کتب ہیں جو اس نے ایام عرب پر تصنیف کی تھیں اور جو اس میدان میں قیمتی اضافہ ہیں۔

ابوعبیدۃ نے اخبار الفرس پر بھی ایک کتاب تالیف کیا تھا۔ ابن ندیم نے اس کا نام کتاب "مقاتل الفرس" لکھا ہے[۵۷] غالباً مصنّف نے اپنی کتاب اخبار الفرس میں عمر کسری کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا تھا کیونکہ مسعودی نے اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔ مسعودی نے ابوعبیدۃ کی دوسری کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے مثلاً "کتاب مقاتل الفرسان"، مگر اس کا نام وہ "مقاتل خرسان العجم" تحریر کرتا ہے[۵۸] اس کی "کتاب مناقب قریش" سے مسعودی نے حلف المطیبین کے واقعات نقل کیے ہیں[۵۹] اور اسی طرح اس کی "کتاب الدیباج" کو "اوضیاء العرب" کے سلسلے میں نقل کیا ہے[۶۰]

جیسا کہ میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ عرب تاریخ کے مواد کو غیر عرب عناصر سے استفادے کا موقع فراہم کرنا شعوبیۃ تحریک کا ایک مثبت کارنامہ تھا۔ کیونکہ اس طرح عربوں کو براہِ راست ایرانیوں کی تاریخ و تہذیب سے واقفیت کا موقع ملا۔ پہلوی زبان سے تاریخ کی کتابوں کے ترجمے

Marfat.com

شروع ہوئے جن کے ذریعے عرب تاریخ نگاری نئے مواد سے آشنا ہوئی۔ ان مترجمین میں سب سے اہم نام ابن المقنع کا تھا۔

ابن المقنع کا انتقال دوسری صدی کے نصف اوّل میں ہوا تھا۔ اس کا ایرانی نام روزبہ بن دازویہ تھا۔ اس کو ترجمے کے کام سے بڑا شوق تھا۔ ابن المقنع کو زبان کی دشواری تو تھی نہیں کیونکہ بقول ابن ندیم کے اس کو عربی و فارسی پر فصاحت کی حد تک قدرت حاصل تھی[۶۱]۔ ابن المقنع شاعر بھی تھا۔ چونکہ وہ بہترین زبان لکھنے پر قدرت رکھتا تھا اس لیے داؤد بن ہبیرہ نے اس کو اپنا سکریٹری مقرر کیا۔ اس کے بعد عیسیٰ بن علی کے یہاں بحیثیت سکریٹری تقرر ہوا۔ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ ابن المقنع نے ترجمے کا کام شروع کیا اور پہلوی زبان سے کئی تاریخی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ابن المقنع نے تاریخ فارس کی مشہور کتاب "خدنیامک"، یا "خدانیامگ"، کا پہلوی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ "کتاب سیر العجم"، اور "کتاب سیر الملوک الفرس"، کے نام سے عربی میں مشہور رہا۔ اس کتاب کا کئی دوسرے علمائے نے بھی ترجمہ کیا لیکن ابن المقنع کا ترجمہ سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ بلکہ دیگر مترجمین نے اسی ترجمے کو اپنے لیے بنیاد بھی بنایا۔ ان ترجموں سے ان مورخین نے استفادہ کیا جنھوں نے تاریخ عالم پر قلم اٹھایا تھا۔ ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ کے ایرانی حصّے کی ترتیب میں اس کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ ابن قتیبہ دنیوری نے بھی اپنی عیون الاخبار میں ابن المقنع کے ترجمے کو پیش نظر رکھا تھا[۶۲]۔ ابن قتیبہ نے بعض مواقع پر جو جملے استعمال کیے ہیں ان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے خدینامک کے اصل نسخہ کو استعمال کیا تھا۔ مثلاً وہ لکھتا ہے "قرأتُ فی کتب سیر ملوک العجم"[۶۳]۔ جس سے پڑھنے والے کا

Marfat.com

ذہن اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے عربی کا اصل ترجمہ دیکھا تھا۔ پروفیسر ثوتنبرگ جنہوں نے "غرر اخبار ملوک الفرس وسیرہم"، اڈٹ کرکے شائع کیا ہے وہ بھی اپنے فرانسیسی مقدمے میں لکھتے ہیں "ثعالبی نے دنیوری، طبری اور مسعودی کے برخلاف ابن المقنع کا اصل ترجمہ نہیں دیکھا تھا بلکہ ایک ایسے نسخے سے استفادہ کیا جو اس کی مدد سے تیار کیا گیا تھا[۶۴]"۔ دنیوری، طبری، مسعودی اور ثعالبی وغیرہ نے پہلوی زبان سے ترجمہ کی ہوئی دوسری کتابوں کو بھی استعمال کیا تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ابن المقنع اور دیگر مترجمین کے ترجمے ضائع ہوگئے اور بدقسمتی سے خدینامک کا اصل پہلوی نسخہ بھی غالباً موجود نہیں ہے۔

ابن المقنع نے چند اور کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ مثلاً کتاب الآئین فی الاصر"، "کتاب مزدک"، "کتاب التاج فی سیرۃ انوشیرواں[۶۵]" یہ کتابیں بھی پہلوی زبان میں تھیں، جنہیں ابن المقنع نے عربی میں منتقل کیا۔ ان ترجموں سے آنے والے مورخین نے فائدہ اٹھایا۔ مسعودی نے مروج الذہب میں کتاب الآئین کا ذکر کیا ہے۔ ابن مسکویہ نے اپنی تجارب الامم میں کتاب التاج کے کئی ٹکڑے نقل کیے ہیں[۶۶]۔ اس طرح ابن الاثیر نے انوشیرواں کے حالات میں ایسے واقعات لکھے ہیں جو مذکورہ مورخین کے یہاں نہیں ملتے۔ ان مورخین کی طرح ابن الاثیر نے بھی ایسے جملے استعمال کیے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس نے براہ راست کتاب التاج کے کئی ٹکڑے اپنی تاریخ میں نقل کیے ہیں۔ اس بنا پر اگر یہ خیال پیدا ہو کہ ابن الاثیر نے "کتاب التاج فی سیرۃ انوشیرواں"، کے اصل نسخے کو استعمال کیا تھا تو اس بات کی تردید خاصی مشکل ہوگی۔

Marfat.com

پہلوی زبان سے کئی اور لوگوں نے بھی ترجمہ کیا ہے یعنی محمد جہم البرمکی، ہشام بن ہشام، بہرام بن مردالنشاہ وغیرہ، حمزۃ الاصفہانی نے اپنی کتاب "تاریخ سنی ملوک الارض" میں ان تمام نسخوں کو پیش نظر رکھا ہے، جنہیں عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس میں ابن المقفع کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ اسفہانی لکھتا ہے کہ "میں نے خدنیا لک کو دیکھا تھا، یہ کتاب فارسی سے عربی میں منتقل ہوئی تھی اور اس کا عربی نام "تاریخ سنی ملوک الفرس" ہے۔ اس کتاب کے متعدد نسخوں کو دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کے مواد میں بڑا اختلاف ہے حتیٰ کہ دو نسخوں میں بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ یہ اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ ترجمہ کے دوران مترجمین کو شبہات پیدا ہوئے" وہ مزید لکھتا ہے۔ "اس باب کو مرتب کرتے وقت یہ ضروری ہو گیا کہ متعدد ترجموں کو پیش نظر رکھا جائے۔ چنانچہ میرے سامنے ۸ نسخے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب میں نے تمام نسخے جمع کر لیے اور ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کر لیا تب اس باب کو مرتب کیا ہے"[6]۔ اصفہانی کی اس رائے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدینامک کے کئی ترجمے ہوئے تھے۔ دوسرے ترجموں کے ناموں میں فرق تھا۔ تیسری بات جو اہم ترین ہے وہ یہ کہ ان کتابوں کے مواد میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اصفہانی کے اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلوی زبان سے تاریخی کتابوں کا ترجمہ کس قدر وسیع ہو گیا تھا۔ ان ترجموں نے عرب تاریخ نگاری کی رفتار ارتقاء پر گہرا اثر ڈالا۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۱۴۴

۲۔ عوانہ بن الحکم بن عیاض بن وزیر بن عبد الحارث الکلبی اپنے دور کا ممتاز اخباری گزرا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش تو معلوم نہیں لیکن وہ کوفے کا رہنے والا اور اس کا آبائی پیشہ سلائی تھا۔ مگر عوانہ نے اپنے آبائی پیشے کو چھوڑ دیا، کیونکہ اس کی بینائی جاتی رہی تھی۔ غالباً اسی بنا پر وہ اپنے پیشے سے منسلک نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کب چلی گئی اس کے بارے میں ہمارے پاس کوئی شہادت نہیں ہے۔ عوانہ اخبار کا تو عالم تھا ہی ساتھ ہی ساتھ شعر و شاعری کے رمز سے آشنا اور فن انساب پر اچھی نظر رکھتا تھا۔ بظاہر عوانہ کی پیدائش اور پرورش کوفہ میں ہوئی لیکن تحصیل علم کی خاطر وہ کہاں کہاں پھرا اس کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس کے بارے میں یہ بھی خیال ہے کہ وہ عثمانی عصبیت کا حامل تھا اور بنی امیہ کے حق میں خبریں گڑھا کرتا تھا۔ عوانہ سے روایت کرنے والوں میں اور ہیثم بن عدی کے اسماء خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۹۳ - ۹۵ J. WELL HAWSEN,
THE ARAB KINGDOM AND ITS FALL. P XIV

۳۔ J. WELL HAWSEN, THE ARAB KINGDOM AND ITS

FALL, P XIV

۴۔ ابن جریر الطبری ۔ تاریخ الرسل والملوک۔ ج ۲ صت۲۰۴

۵۔ خیر الدین زرکلی ۔ الاعلام ج ۵ صت۲۷۲

۶۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست صت۱۷

۷۔ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۶ صت۹۳

۸۔ بلاذری ۔ انساب الاشراف ج ۵ صت۲۰-۲۱ ۔ ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۲ صت۳۰۹-۳۱۱

۹۔ ابو مخنف لوط بن یحیٰی بن سعید بن مخنف بن سلیم کوفہ کے قبیلہ "ازد" سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا خاندان عرصے سے کوفہ میں آباد اور عزت و شرف کا مالک تھا۔ اس کو اس معاملہ میں شہرت بھی حاصل تھی۔ ابو مخنف کس سال پیدا ہوا اس کے بارے میں تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ لیکن اتنی بات تو قرین قیاس ہے کہ وہ کوفہ ہی میں پیدا ہوا اور یہیں اس کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی تھی ۸۲ھ میں جب محمد بن الاشعث نے بغاوت کی اس وقت ابو مخنف کی عمر ۲۵ سال سے کچھ اوپر تھی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنگ صفین میں قبیلہ ازد کا لیڈر مخنف بن سلیمان تھا جو اسی خاندان کا ایک ممتاز سردار تھا۔ ابو مخنف کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ محمد بن سائب الکلبی کا دوست اور بعد میں اس کے لڑکے ہشام کا دوست تھا۔ اس تعلق سے ابو مخنف نے باپ اور بیٹے دونوں سے استفادہ کیا تھا۔ ابو مخنف کا انتقال ۱۵۷ھ ہجری میں ہوا۔

یاقوت الحموی ، ارشاد الاریب ج ۶ صت۲۲۰-۲۲۴

J. WELL HAWSEN, THE ARAB KINGDOM AND ITS FALL SEE PREFACE.

۱۰۔ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۲۲۴

۱۱۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۲۔۱۴۳

۱۲۔ ابن جریر الطبری ۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۵ ص ۲۸۰

۱۳۔ ہشام بن عروۃ اپنے زمانے کے زبردست فقیہہ مشہور مستند محدث اور بلند پائے کے عالم تھے، ان کی عمر کا بڑا حصہ مدینہ میں گزرا اور عہد آخر میں وہ عراق چلے گئے۔ جہاں ۱۴۶ھ کے دوران بغداد میں انتقال ہو گیا۔ اس طرح ان کی عمر ۸۰ سال ہوئی۔ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۴۴۔۱۴۵

۱۴۔ طبری، فہرست تاریخ طبری ص ۶۱۳

۱۵۔ " تاریخ الرسل والملوک ج ۶ ص ۲۷۴

۱۶۔ سیف بن عمر الاسدی التمیمی کوفہ کا رہنے والا اور اپنے معاصرین میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ یہ کس سال پیدا ہوا اس کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ البتہ اس کی پرورش اور تعلیم کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوفہ میں ہوئی تھی۔ اس کو تاریخ اسلام سے شدید دلچسپی تھی۔ یہ سیف کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے اساتذہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو فن تاریخ نگاری کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً ہشام بن عروۃ، عبید اللہ بن عمر، جابر الجعفی، محمد بن اسحٰق، محمد بن اسحٰق الکلبی اور طلیحہ بن اعلم۔ سیف نے تاریخ اسلام کے متعدد پہلوؤں پر قلم اٹھایا تھا۔ ابن ندیم نے اس کی تالیفات کا ذکر کیا تھا۔ اس کا انتقال سنہ ۱۸۰ھ میں ہوا۔

ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۳

ابن حجر العسقلانی، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۹۵۔۲۹۶

۱۷۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۳

۱۸۔ ابن حجر العسقلانی ۔ تہذیب التہذیب ج ۴ ص۲۹۶

۱۹۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص۱۴۳

۲۰۔ BROCKELLMANN – SUPPL. VOL. 1 P 214

۲۱۔ نصر بن مزاحم کا سال پیدائش نہیں معلوم ہے ۔ یہ بنی منقر سے تعلق رکھتا اور اس کا پیشہ عطاری تھا ۔ کوفہ میں اس کی تربیت ہوئی تھی ۔ غالباً تجارت سے اس کو دلچسپی نہیں تھی اس لیے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہوا ۔ چونکہ تاریخ سے شوق تھا اس لیے اس شوق کو پروان چڑھایا اور اس موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ غالباً وہ حضرت علی اور آل بیت سے عقیدت رکھتا تھا اس لیے تذکرہ نگاروں نے اس کو غالی شیعہ قرار دیا ہے ۔ اس کی کتابوں کو ابو سعید الاشج اور نوح بن حبیب نے روایت کیا ہے ۔ محدثین تو اس سے برہم تھے ہی مورخین نے بھی اس کو کاذب قرار دیا ہے ۔ یاقوت نے ۲۱۲ھ کو نصر کا سال انتقال قرار دیا ہے ۔

۲۲۔ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۷ ص۲۱۰

۲۳۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص۱۴۳

۲۴۔ علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی یوسف المدائنی ۱۳۵ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا ۔ اس کی کنیت ابوالحسن تھی ۔ قبیلہ قریش کی ایک شاخ کا غلام تھا جس نے اس کو آزاد کر دیا تھا ۔ اس کی پرورش اور نشو و نما بصرہ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم بھی اسی شہر میں مکمل ہوئی ۔ لیکن بصرہ میں زیادہ دنوں تک قیام نہ رہ سکا چنانچہ عنفوان شباب ہی میں بصرہ چھوڑ کر مداین چلا گیا اسی لیے مداینی کی حیثیت سے مشہور ہوا ۔ چونکہ اس کی علمی دلچسپیاں مذہبی مضامین سے بھی تھیں اس لیے مشہور عالم دینیات محمد بن الاشعث کی شاگردی اختیار کی ۔ یہاں بھی اس کا قیام عرصہ تک نہ رہ سکا اور مداین کو خیرباد کہہ کر بغداد چلا گیا ۔ اس زمانے میں بغداد

علمی ترقی کے اوج کمال پر تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس کی توجہ ادب اور تاریخ کی طرف تھی، جب بغداد آیا تو اس ذوق کو اور جلا ملی۔ حسن اتفاق سے ایک دولت مند وزیر ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم الموصلی نے اس کی سرپرستی قبول کر لی اور اس کے لیے اپنے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ مداینی بغداد کی چیدہ اور اعلیٰ سوسائٹی میں رہتا تھا۔ اس کا شب و روز کا اٹھنا بیٹھنا وزرا۔ اور امراء سلطنت کے بیچ میں ہوتا تھا۔ بغداد کے مشہور جج یحییٰ بن اکثم اور خلیفۂ مامون کے وزراء سے اس نے مراسم پیدا کر لیے تھے۔ ابراہیم بن اسحٰق الموصلی اس کا قریبی دوست تھا۔ خلیفہ اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ابراہیم نے رشید، مامون اور واثق کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بے تکلفی سے ان کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ ابراہیم صاحب علم بھی تھا اور فن موسیقی و تاریخ سے خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ اس شوق کی بنا پر خلفاء عباسیہ سے اس کے مراسم اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ کیونکہ اسی ذریعے سے اس کو سلطنت کے اہم حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا اور اسی ذریعے سے مداینی نے دولت عباسیہ کے اکثر حالات معلوم کیے جو بڑی حد تک مستند ہیں۔ مداینی سے استفادہ کرنے والوں میں زبیر بن بکار، ابن ابی خیثمہ، احمد بن حارث الجزار اور حارث بن ابی اسامہ جیسے علماء انساب و اخباری گزرے ہیں۔ مداینی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ کتابوں میں مذکور ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ مجھ سے احمد بن زہیر نے کہا: "میرے باپ، یحییٰ بن معین اور مصعب الزبیدی شام کے وقت اکثر مصعب کے یہاں جمع ہوتے تھے۔ ایک شام کو سب لوگ بیٹھے تھے کہ ایک آدمی تیز رفتار گدھے پر اس طرف سے گزرا۔ یحییٰ بن معین نے سلام کیا اور کچھ پوچھا پھر دریافت کیا کہ وہ شخص کون ہے؟ جواب ملا! میں اس سخی کے پاس جا رہا ہوں جو میری

Marfat.com

آستین کو اوپر سے نیچے تک درہم و دینار سے بھر دیتا ہے۔ یحییٰ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ جواب ملا! ابو محمد اسحٰق بن ابراہیم الموصلی۔ احمد بن زہیر کہتے ہیں کہ جب وہ لوٹا تو یحییٰ بن معین نے کہا۔ ثقۃ، ثقۃ، ثقۃ۔ احمد بن زہیر نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے انہوں نے بتایا مدائنی ہے"۔ مدائنی نے بغداد میں بڑی خوشحالی کی زندگی گزاری اور اپنے محسن کے گھر ہی پر ۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست۔ ص ۱۰۰تا۱۰۲۔ یاقوت الحموی۔ معجم الادباء ج ۱۴ ص ۱۲۴تا۱۲۶۔ ابن الخطیب، تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۵۴۔ ENCY. OF ISLAM, VOL 3 P. 81 – 82 BROCKELMANN, VOL. 1, P. 214.

۲۵۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۰۰تا۱۰۲،

۲۶۔ " " " "

۲۷۔ WELHAWSEN, THE ARAB KINGDOM AND ITS FALL, P. XV

۲۸۔ PROF. GIBLE, STUDIES ON THE CIVILIZATION OF ISLAM – P. 110

۲۹۔ ابو الیقظان کے بارے میں ابن ندیم کا خیال ہے کہ "وہ اخبار، انساب، مآثر اور مثالب کے موضوع پر زبردست عالم گزرا ہے۔ اس نے جو بھی روایت کی اس میں صداقت پائی جاتی ہے۔ اس کی متعدد کتابوں کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ مثلاً کتاب حلق تمیم بعضھا عن بعض، کتاب اخبار تمیم، کتاب نسب خندق، کتاب النسب الکبیر اور کتاب النوادر وغیرہ۔

ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۹۴

۳۰۔ محمد بن سائب الکلبی کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا تذکرہ نہیں ملتا البتہ اس کا

Marfat.com

سال انتقال ۱۴۶ھ بتایا جاتا ہے۔ یہ عہد جاہلیت کی تاریخ پر وسیع نظر رکھتا تھا۔ اس موضوع پر اس نے بہت وسیع معلومات اکٹھا کی تھیں۔ اس کو تفسیر سے بھی دلچسپی تھی، لیکن محدثین وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ یہ ابن عباس کے تلامذہ میں سے تھا۔ اس کی تفسیر کا ایک نسخہ برلن کی لائبریری میں موجود ہے۔

ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۹۵

۳۱۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۹۵

۳۲۔ ہشام کی پیدائش غالباً کوفہ میں ہوئی تھی لیکن وہ یہاں سے بغداد چلا آیا۔ جس زمانے میں وہ بغداد آیا اس وقت تک وہ کافی مشہور ہو چکا تھا۔ کیونکہ آتے ہی وہ خلیفۂ وقت کی عنایتوں سے بہرہ یاب ہوا۔ ابن الخطیب نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مامون اس کے باپ سے نہ صرف یہ کہ آگاہ تھا بلکہ اس سے خلیفہ کے مراسم بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خلیفہ کی مالی امداد بھی حاصل کرتا رہا ہو۔ اس لیے ہشام جب بغداد آیا تو اس نئے ماحول میں اس کو اجنبیت نہیں محسوس ہوئی۔ وہ بہت ہی جلد مشہور علم دوست اور یگانۂ روزگار مربی علم جعفر بن یحییٰ البرمکی سے وابستہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ جعفر سے اس کے تعلقات خاصے گہرے ہو گئے۔ کیونکہ ہشام نے فن انساب پر ایک کتاب لکھ کر اس کو دی تھی۔ اسی طرح ہشام نے ایک اور کتاب "الفرید فی الانساب" لکھ کر مامون کو پیش کی۔ ہشام نے ماقبل اسلام کی تاریخ اپنے باپ سے حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے بیشتر شیوخ اس کے اساتذہ میں شامل تھے مثلاً مجاہد، محمد بن ابی السری، محمد بن سعد کاتب الواقدی، ابو الاشعث، اور احمد المقدام وغیرہ۔ ہشام کا حافظہ بہت تیز تھا۔ چنانچہ ایک روایت سے جو خاصی مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے پورے قرآن کو

تین دن کے اندر حفظ کر لیا تھا۔ اس کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا۔ ہشام اپنے پیچھے بے شمار کتابیں چھوڑ گیا جو بعد میں آنیوالے مورخین کے لیے بطور مواد کام آیا۔

ابن سعد بن ۔ طبقات ابن سعد، ج ۶ ص ۲۴۹، ابن الخطیب ۔ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۵-۴۶ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۷، ص ۲۵۰-۲۵۴ ذہبی ۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۱۴، ابن حجر العسقلانی ۔ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۴۴ ۔ بروکلمان ج ۱ ص ۲۱۱

۳۳۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۴۶

۳۴۔ ابن الخطیب ۔ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۵

۳۵۔ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۷ ص ۲۵۰

۳۶۔ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان ج ۵ ص ۱۳۱

۳۷۔ " " " "

۳۸ ابن الاثیر ۔ تاریخ الکامل ج ۱ ص ۲۱۳

۳۹۔ ابن الخطیب ۔ تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۵

۴۰۔ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۷ ص ۲۵۰

۴۱۔ ڈاکٹر جواد علی ۔ موارد تاریخ الطبری ۔ المجمع العلمی العراقی ۱۹۵۱ء

۴۲۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ معصب کا انتقال ۲۳۳ھ میں ہوا۔ اس کی یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۴۳ ہیثم کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہے۔ "وہ شعر، اخبار، مثالب ومناقب، مآثر اور انساب کا زبردست عالم تھا۔ اس کا انتقال ۲۰۷ھ میں ہوا۔ ابن ندیم کتاب الفہرست ص ۹۹-۱۰۰۔ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان ج ۵ ص ۱۵۷-۱۵۸۔

۴۴۔ فہرست طبری ۔ ۶۱۸

Marfat.com

۴۵۔ مسعودی۔ التنبیہ والاشراف ص۱۰۷ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۱۴۵۔

۴۶۔ " " " ص۳۰۷

۴۷۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۱۴۶

۴۸۔ " " ص۵۳

۴۹۔ " " ص۵۴

۵۰۔ ابوعبیدۃ بنی تمیم کا ایک آزاد غلام تھا۔ وہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہ بنی عبیداللہ بن معمر التیمی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ وہ بڑا زبان دراز اور بے لگام مشہور تھا اور عام طور پر لوگوں کے عیوب ڈھونڈھ کر نکالتا اور انہیں اچھالتا تھا۔ چنانچہ اس کی تنقیدوں سے بہت کم لوگ بچتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی ہمدردیاں خوارج کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ وہ عرب ملوکیت کا مخالف تھا۔ اس کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو براہِ راست شعوبیۃ تحریک کے روحِ رواں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا ذہین اور بلا کا تیز تھا۔ اس نے لغت کے علاوہ دوسرے موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ خوارج سے متعلق ہونے کی بنا پر لوگوں کے جذبات اس کے خلاف خاصے برانگیختہ تھے، اس لیے جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ اس کا انتقال ۲۱۴ھ میں ہوا۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۵۳-۵۴۔ ابن حجر۔ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص۲۴۶-۲۴۸۔ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۷، ص۱۶۴

۵۱۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۵۴

۵۲ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۷، ص۱۷۵

۵۳۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۵۴

۵۴۔ فہرست طبری ص ۸۳

۵۵۔ ابن الاثیر ۔ تاریخ الکامل ج ۱ ص ۱۷۸-۲۵۴

۵۶۔ BROCK ELMANN. G.I P 102

۵۷۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۸۰

۵۸۔ مسعودی التنبیہ والاشراف ص ۹۰

۵۹۔ " " " ص ۲۸۰

۶۰۔ " " " ص ۲۰۹

۶۱۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۷۸

۶۲۔ ابن قتیبہ ۔ عیون الاخبار ج ۱، ۲، ۳ ۔

۶۳۔ " " ج ۲ ص ۱۴۶-۲۱۶ ج ۳ ص ۲۸۴

۶۴۔ ثعالبی ۔ غرر اخبار ملوک الفرس وسیرہم ۔ دیکھئے نوتنبرگ کا فرانسیسی مقدمہ ۔

۶۵۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص ۱۷۱

۶۶۔ کتاب التاج والآئین کے وہ تمام ٹکڑے جو تاریخ کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں ان سب کو ایک ایرانی عالم ڈاکٹر محمد محمدی نے جمع کر کے کتاب التاج والآئین کے نام سے شائع کر دیا ہے ۔

۶۷۔ اصفہانی ۔ تاریخ سنی ملوک الارض ص ۱۰۹

چوتھا باب

عالمی تاریخ نگاری کا مرحلہ

دوسری صدی ہجری کے خاتمے تک عرب تاریخ نگاری کے میدان میں بڑا قیمتی ادب پیدا ہوا اور اس کی متعدد شاخوں میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں جن سے فن تاریخ اپنے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے مواد اور سرمایہ حاصل کر سکتی تھی۔ مغازی، فتوح، اخبار، انساب، اور علم اللغتہ کی شاخوں میں بہت زیادہ مواد جمع کیا گیا اور مقامی، خاندانی، طبقاتی، تاریخ کے موضوع پر کافی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ تیسری صدی کے آغاز میں تاریخ نویسی کے میدان میں ایک اور شعور کی لہر اٹھتی نظر آتی ہے، وہ شعور علاقائیت اور دوسرے تنگ دائروں سے نکل کر ایک وسیع نقطہ نظر سے تاریخ کو دیکھنے کا ہے۔ اس طرح تاریخ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹنے کے بجائے اس کو مجموعی طور پر ایک دوسرے سے مربوط کرنے اور اس کی مدد سے تاریخ کا وسیع منظر پیش کرنے کا ہے تاکہ اس انسانی گروہ کے کارنامے جو اب تک مغازی، فتوح وغیرہ جزئیات میں بٹے تھے ان سب کو حاصل کر کے، تلاش و تحقیق، تجزیہ و تنقید کے بعد عام تاریخ کی شکل میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس شعور نے عملی صورت اختیار کرنا شروع

Marfat.com

کیا اور اس فکر کے تحت لکھنے والے کئی مورخ پیدا ہوتے جن میں سرفہرست بلاذری کا نام لیا جاسکتا ہے۔

احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری تیسری صدی کا مشہور مورخ گزرا ہے۔ اس نے تاریخ کے میدان میں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں انساب الاشراف بہت ضخیم اور قیمتی کتاب ہے۔ بلاذری نے اپنی اس کتاب میں تاریخ عام کی خصوصیات کو ملحوظ رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس طرح اس نے مغازی فتوح اور انساب کے مواد کو یک جا کر کے اس نئے فکر کا اظہار کیا ہے۔ خلفاء اسلام اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں کے ناموں کا عنوان قائم کر کے اس نے اس دور کے حالات کو قلم بند کیا ہے اور اس طرح انساب الاشراف میں انساب و طبقات کی خصوصیات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ پہلے وہ خلفاء کی سیرت بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد ہر خلیفہ کے عہد کے عام حالات کو قلم بند کرتا ہے۔ آخر میں وہ سیاسی تحریکوں ان کی سرگرمیوں کو ذیلی عنوانات قائم کر کے درج کرتا ہے۔ ان واقعات کی ترتیب میں وہ تاریخی تسلسل یعنی ترتیب، زمانی کو ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بہر حال ترتیب زمانی کے اصول کی پابندی نہیں کی ہے۔ مثال کے طور پر وہ یزید کے حالات حضرت عثمان سے پہلے درج کرتا ہے۔

بلاذری جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ اپنے پیش رو مورخین کے بیانات کو بغیر چھان بین کے قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ واقعات، اخبار وغیرہ جمع کرتا پھر ان پر تنقیدی نگاہ ڈالتا، اس کے بعد جو واقعہ اس کے معیار پر پورا اترتا اس کو منتخب کر کے اپنی کتاب میں جگہ دیتا ہے۔ اس کی اس تنقیدی صلاحیت کا اظہار اس کی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے یہ جملے اس شعور کا پتہ دیتے

Marfat.com

ہیں۔ ابو مخنف فی اسنادہ، اور الواقدی فی اسنادہ۔ اس جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اس دور میں سابق مورخین کے خیالات کو بطور سند کے بیان کرنے کا رجحان پیدا ہو چلا تھا اور لوگ بطور سند کے دوسروں کی رائے نقل کرتے تھے۔

بلاذری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعات کے انتخاب میں ایک خاص رویہ اختیار کرتا ہے یعنی جس علاقہ یا شہر کا واقعہ اس کو بیان کرنا ہے اس کے لیے وہ ایسے اشخاص یا ان کی کتابوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اسی علاقہ یا شہر کے رہنے والے ہوں۔ اس رویے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معلومات کے حصول کے لیے براہ راست ماخذ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب شوریٰ کے بارے میں اپنی معلومات درج کرتا ہے تو زہری اور واقدی کی روایات کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ مدنی روایات کی قدیم ترین سند ہو سکتے تھے۔ ان معلومات کو نقل کرنے کے بعد اگر کسی اور روایت کا پتہ چل جاتا تو اسے بھی ضمیمے کے طور پر درج کر دیتا ہے۔ بلاذری عام طور پر ابو مخنف کی روایات ہی بطور ضمیمہ درج کرتا ہے۔

بلاذری نے انساب کے موضوع پر جو مواد نقل کیا ہے اس کا بنیادی ماخذ زبیر بن بکار ہیں۔ زبیر مشہور عالم مصعب بن عبداللہ بن مصعب الزبیر کے بھتیجے تھے۔ ان کا انتقال ۲۵۶ھ میں ہوا۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں جن کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ یہ فن زبیر کے گھرانے کا پسندیدہ مضمون رہا ہے اس لیے ان کو بھی فن انساب میں کمال پیدا کرنے میں آسانی ہوئی۔ بلاذری نے ان سے براہِ راست استفادہ کیا

Marfat.com

تھا۔ عبدالملک بن مروان کے حالات قلم بند کرتے وقت بلاذری نے عوانہ بن الحکم، واقدی اور مدائینی کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اسی طرح "الحرا،، کے حادثے پر وہ عوانہ، واقدی، مدائینی اور دوسرے مدنی علماء کو بطور سند کے پیش کرتا ہے۔

بلاذری کی معلومات پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے عام طور پر مستند ماخذ پر اعتماد کیا ہے۔ اس نے اپنے ہم عصر واقعات کو حاصل کرنے کے لیے ایسے لوگوں سے رابطہ پیدا کیا جو ثقہ اور قابل اعتماد تھے۔ اس کے تعلقات کا دائرہ بھی خاصا وسیع تھا۔ وہ خلیفہ معتز کے لڑکوں کا استاذ بھی تھا۔ نیز متوکل اور مستعین سے اس کے مراسم بہت اچھے تھے۔ لیکن بحیثیت مورخ اس نے اس عصبیت سے اپنے آپ کو بلند رکھنے کی کوشش کی جو اموی و عباسی سیاست میں کارفرما تھی۔ چنانچہ اپنے تعلقات اور حیثیت کے باوجود اس نے تاریخ نویسی کے فن میں غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی۔

بلاذری کی کتاب انساب الاشراف کو آنے والے مورخین نے تفصیل سے نقل کیا ہے۔ ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ میں اس کتاب سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح ابن الاثیر نے بہت سے واقعات مثلاً یوم افتتار الاول وغیرہ وغیرہ حرف بہ حرف اس کتاب سے نقل کیا ہے۔ اس کتاب کے سب حصے ابھی شائع نہیں ہوتے ہیں۔

بلاذری کی دوسری اہم کتاب فتوح البلدان ہے۔ یہ ان فتوحات پر مشتمل کتاب ہے۔ جو صدر اسلام میں مسلمانوں نے متعدد ملکوں اور شہروں پر حاصل کی تھیں۔ بلاذری نے یہ معلومات ان چھوٹے چھوٹے رسائل سے حاصل

کی تھیں۔ جو اس کے پیش رو یا ہم عصر وقائع نگاروں نے انفرادی طور پر ان متعلقہ موضوعات پر تصنیف کی تھیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی واقعہ کے بارے میں صرف ایک ہی راوی کے بیان کو نقل کرتا ہے اور اسی واقعہ سے متعلق دوسرے راویوں کے بیانات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ البتہ وہ اس سلسلے میں انتخاب سے کام لیتا ہے اور عام طور پر ایسے راوی کے بیان کو ترجیح دیتا ہے جس کا اس واقعہ سے جغرافی یا زمانی اعتبار سے زیادہ قریبی واسطہ رہا ہو۔ بلاذری نے اپنی اس کتاب میں کبھی کبھی ایسے تبصرے بھی کیے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصے اہم ہیں اور جن کی بنا پر وہ اپنے ہم عصروں سے ممتاز بھی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کہیں کہیں ایسے اشارے ملتے ہیں جو معاشی، معاشرتی اور تنظیمی خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب سے بعد میں آنے والے مورخین نے استفادہ کیا ہے۔ ابن الاثیر نے فتح سندھ کے واقعہ کو اسی کتاب سے حرف بہ حرف نقل کیا ہے۔

اس نوعیت کا دوسرا مورخ احمد بن ابی یعقوب بن جعفر بن وہب ہے جو اپنے عہد کا مشہور مورخ گزرا ہے۔ یعقوبی شیعہ عقیدے کا مسلمان تھا۔ اس کا تعلق اس فرقہ کے مساویہ طبقے سے تھا جو امامیوں کی ایک شاخ ہے اور جو اپنی رواداری اور اعتدال پسندی کے لیے مشہور رہا ہے۔ اس نے اپنی جوانی کا بڑا حصہ آرمینیہ میں گزارا جہاں وہ غالباً کسی ملازمت کے سلسلے میں رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ خراسان چلا گیا اور سلطنت طاہریہ میں سکریٹری کا عہدہ قبول کر لیا۔ یعقوبی کو دور دراز مقامات، شہروں اور ملکوں کے سفر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کی بنا پر اس نے بہت سے ملکوں کے حالات وہاں کے باشندوں کی بود و باش، رہن سہن، دریاؤں

Marfat.com

پہاڑوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کے علاوہ اسکا انتظامی تجربہ بھی اس کے بہت کام آیا، کیونکہ اس ذریعے سے وہ بہت سے سیاسی واقعات، معاہدوں، سرکاری کاغذات، دستاویزوں اور بین الملکی معاملات کو جاننے اور سمجھنے کا اسے موقع ملا جس نے تاریخ نگاری کے کام میں بہت ساتھ دیا۔

یعقوبی نے ظاہری امراء کے حالات پر ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ غالباً اس کتاب کو خراسان کے دوران قیام میں مکمل کر لیا تھا۔ اس کتاب کو بھی عام تاریخ کی کتاب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسرائیلی قائدین مذہب کے حالات سے لے کر اپنے دور یعنی ۲۵۹ھ تک کے حالات کو تحریر کیا تھا۔ پہلے حضرت عیسیٰ مسیح کے واقعہ کو قلم بند کرتا ہے۔ اس کے بعد ان کے شاگردوں کا ذکر ہے۔ پھر سیریا، بابل، ہندوستان، یونان، روم اور فارس کے حکمرانوں کے حالات قلم بند کرتا ہے۔ نیز، ترک، چینی، مصری، بربر، حبشی، اور نیگرو اقوام کی تاریخ لکھتا ہے اور آخر میں عرب ما قبل اسلام کی تاریخ درج کرتا ہے۔ اسی مواد پر کتاب کی پہلی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری جلد جو نسبتاً زیادہ طویل ہے آنحضرت کی تاریخ پیدائش سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد عہد بعہد اسلامی تاریخ کے واقعات بیان کرتے ہوئے ۲۵۹ھ تک آکر اس جلد کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ یاقوت الحموی نے اس کتاب کا نام "کتاب التاریخ الکبیر" درج کیا ہے[۵]۔ اس کی دوسری کتابوں میں "کتاب اسماء بلدان"، "کتاب فی اخبار الامم السالفۃ" اور "کتاب مشاکلۃ الناس فی زمانہم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں۔

Marfat.com

یعقوبی نے اپنی تاریخ کو ترتیب زمانی کے تحت مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں ان قوموں کی قدیم تاریخ کو نہایت اختصار سے درج کیا ہے جو عربوں کی ہمسایہ تھیں۔ البتہ ان تفصیلات کو جو دیگر کتابوں میں پائی جاتی ہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ اساطیر و افسانوں کو غالباً تاریخ کے دائرے سے خارج سمجھتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نے ایام عرب پر ایک سطر بھی نہیں لکھی ہے۔ اگر وہ اس موضوع پر کچھ بھی لکھتا تو کتاب کا توازن نہ بگڑنے پاتا۔ دوسری جلد میں اس نے بنی امیہ، بنو عباس اور دوسرے حکمراں خاندانوں اور ان کے علاقوں کی تاریخ لکھتے وقت معتبر کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ اساطیر و خرافات سے جو اجتناب یعقوبی کے یہاں پایا جاتا ہے وہ دراصل اس کے سائنٹیفک ذہن کے میلان کی علامت ہے۔ یہی میلان واقعات کے انتخاب میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس نے تلاش کر کے بہت سے موضوعات پر اپنی معلومات کو کتاب میں درج کیا ہے۔ قدیم ایران کی تاریخ کے موضوع پر کتاب خدانیامہ، مورخ ابن الکلبی اور دوسرے مورخین کی کتابوں کو اپنا ماخذ بناتا ہے۔ اسی طرح یونانی اور رومن واقعات سے واقفیت کے لیے ان ترجموں سے کام لیتا ہے جو تیسری صدی میں ہوتے تھے۔ اسی طرح مصریوں اور رشوریوں کے مختصر حالات ان کتابوں سے نقل کرتا ہے جو اس وقت موجود تھیں۔

یعقوبی کو تاریخ کے مضمون کے علاوہ جغرافیہ سے بھی شغف تھا۔ اس نے اس موضوع پر اپنی معلومات کو اس سفر میں حاصل کیا جس کو مکمل کرنے کا اسے اتفاق ہوا تھا۔ یہ جغرافی معلومات اس کے مشاہدے اور ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔ ان معلومات کو اس نے اپنی کتاب "اسماء البلدان" میں جمع

Marfat.com

کر دیا تھا۔

اس کی تیسری کتاب "کتاب فی اخبار الامم السالفۃ" تھی۔ اس کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اندر تخلیق آدم سے لے کر مصریوں، اشوریوں، اہل بابل، ایرانیوں، چینیوں اور رومیوں کے بارے میں قدیم احوال درج رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے ان خبروں کی عام طور پر بہت زیادہ اہمیت نہیں ہی ہوگی۔ یہ کتاب اب نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس کتاب کے ٹکڑے کسی مروجہ تاریخی کتاب میں موجود ہیں کہ اس کی مدد سے اس کتاب کے مضمون کے بارے میں کوئی حتمی بات کہی جا سکے۔ تاہم اس کا امکان ہے کہ اس نے وہب بن منبہ وغیرہ کی کتابوں سے واقعات نقل کیے ہوں۔ یونانیوں اور رومیوں کے بارے میں عربوں کی معلومات متعدد اسباب کی بنا پر بہت زیادہ بھروسے کے قابل نہیں ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ رہی ہو کہ اہلِ عرب نے اس خطّے کی تاریخ سے دلچسپی ہی نہیں لی تھی حالانکہ اہلِ عرب کا تعلق ان سے بہت ہی قدیم زمانے سے تھا۔ اہلِ روم کے نسب پر جو معلومات ملتی ہیں اور جنہیں عام طور پر ابن الکلبی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ خاصی دلچسپ ہیں۔ ابن ندیم نے چند کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں جن کے عنوان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصّوں اور کہانیوں پر مشتمل تھیں۔ ان کا ترجمہ بھی عربی میں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام "سمسہ ودمن" ہے۔ دوسری کتاب کا نام "کتاب تاریخ الروم" ہے۔ ابن ندیم نے اس کے مترجم یا مؤلف کا نام نہیں لکھا ہے۔ حمزۃ الاصفہانی نے یونانیوں کے بارے میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کے مترجم کا نام وہ حبیب بن بہریز مطران موصل تحریر کرتا ہے۔ اس نے ملوک الیونانین کے موضوع پر اس کتاب سے استفادہ کیا تھا۔ اسی

حلبیب نے مامون کی خواہش پر کئی اور کتابوں کی تشریح کی تھی؟ ایک اور مشہور مصنف ابو معشر جعفر بن محمد البلخی تھا جس کا انتقال ۲۷۲ھ میں ہوا۔ اس نے "کتاب الالوف" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کے اندر آٹھ مقالات تھے۔ بروکلمان نے اس کا نام "کتاب الادوار والالوف" تجویز کیا ہے۔ اس کتاب سے حمزۃ الاصفہانی نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کتاب کی ضرورت سلاطین یونان و روم کی فہرست مرتب کرتے وقت پیش آئی تھی۔ اس کے علاوہ ابو معشر نے چند اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جو تاریخی مواد پر مشتمل تھیں۔[۳]

یعقوبی یا طبری نے ابو معشر کی کتاب کا بحیثیت ماخذ ذکر نہیں کیا، لیکن حمزۃ الاصفہانی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حمزۃ نے جو معلومات کتاب الادوار سے اخذ کی ہیں اس کا طبری یا یعقوبی کی معلومات سے موازنہ کیا جائے تو ان میں باہمی طور پر فرق نظر آتا ہے۔ ان ترجموں اور تالیفات نے تیسری صدی کے مورخین کے لیے تاریخ یونان اور روم کے لیے بطور ماخذ کام دیا۔ لیکن یہ ترجمے بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ عرب مورخین نے ان قوموں کی تاریخ جاننے کی علمی کوشش بھی نہیں کی جیسا کہ ان کے یہاں ایران کی قدیم تاریخ جاننے کی آمادگی نظر آتی ہے۔ ایرانی ماخذ کے بارے میں یہ آسانی بھی ہوئی کہ اہل ایران نے اپنی کتابوں کا ترجمہ کر کے عربوں کے لیے عام کر دیا۔ اس کے برخلاف بازنطینی علماء تاریخ نے اپنی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنے کی آمادگی بھی ظاہر نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے علوم سے شاید عربوں کو مستفید بھی نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عربوں نے ان کی زبان سیکھنے

Marfat.com

اور ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے کی کوئی منظم کوشش بھی نہیں کی۔ تاہم عرب کب تک اس معاملے سے غافل رہ سکتے تھے۔ شام و مصر، عراق و اسپین بازنطینی سلطنت کے پرانے حصّے تھے اور ایک زمانے میں شام و عراق کے بعض قدیم شہر یونانی علوم کا عالمی مرکز بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ اپنی پرانی آبادی کے ساتھ وہ علمی روایات بھی اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ عربوں نے رومیوں اور یونانیوں کے بارے میں جو معلومات بھی اپنی کتابوں میں درج کی ہے وہ غالباً انہیں لوگوں سے زبانی طور پر معلوم کی تھیں۔ اس لیے عرب مورخین کے لیے جو مواد بھی کام آیا وہ بہت زیادہ ثقہ کے قابل نہیں تھا۔ اسی طرح کے مواد کو غالباً یعقوبی نے بھی استعمال کیا ہوگا۔

یعقوبی کا ایک ہم عصر مورخ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری ہوا ہے[۴]! یہ یعقوبی کا ہم پیشہ اور صوبہ جبل میں عرصے تک قاضی بھی رہ چکا تھا۔ بغداد آکر اس نے تعلیم و تعلّم کا پیشہ اختیار کیا اور زندگی کے آخری دنوں تک انجام دیتا رہا۔ دینوری کو اخبار و ایام سے گہری دلچسپی تھی۔ کوفہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ کوفی راویوں اور اہلِ اخبار سے بہت قریب رہا اور ان سے استفادہ کا خاصہ موقع ملا، جس کی جھلک اس کی کتاب میں پائی جاتی ہے۔

دینوری کی دلچسپیاں بنیادی طور پر کئی مضامین سے تھیں اور اپنے زمانے کے عام مذاق اور ضروریات کے مطابق اس نے علم کے ہر میدان میں قدم رکھا۔ چنانچہ اس نے مروجہ علوم کے ہر مضمون پر اپنا قلم اٹھایا۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے دور کے ان لوگوں کی ضروریات کو پورا کر سکے جو دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے اور اپنے علم کی بدولت اعلیٰ عہدے و منصب

Marfat.com

حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیوری کی دو اہم کتابیں چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ایک کا نام "کتاب المعارف[۱۵] اور دوسری کتاب کا نام "عیون الاخبار" ہے[۱۶]۔ کتاب المعارف متعدد علوم و فنون کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ کتاب تخلیق کائنات کے مضمون سے شروع ہوتی ہے۔ پھر تاریخ الانبیاء کا مواد ہے یعنی ہر ہر پیغمبر کا زمانہ اس کی عمر اور اولاد وغیرہ، اس کے بعد عربوں کا عام نسب نامہ ہے، پھر آنحضرت کا شجرۂ نسب درج ہے۔ آنحضرت کی زندگی کے اہم حالات، واقعات اور جنگیں بیان کی گئی ہیں اور آخر میں آپ کی وفات کا حال درج ہے۔ پھر عشرۂ مبشرہ، مشہور صحابہ، اور امیر معاویہ سے لے کر مستعین باللہ کے عہد تک کے واقعات مندرج ہیں۔ اصحاب رائے، ناقدین حدیث، ممتاز شیعی حضرات کے حالات، حجاز، مکہ، عراق و شام کے قراء اور ان کے احوال اگلے باب میں درج کیے گئے ہیں۔ یعقوبی علماء انساب، اصحاب اخبار، رواۃ شعر، اور علمائے نحو وغیرہ کے بارے میں اپنی معلومات کو نہایت مرتب طریقے سے منضبط کرتا ہے۔ اس کے بعد مشہور عمارتوں اور مساجد کے تذکرے ہیں یعنی وہ بیت المقدس، کوفہ و بصرۃ، مدینہ و دمشق کے حالات تحریر کرتا ہے۔ پھر وہ جغرافی پہلوؤں پر قلم اٹھاتا ہے۔ مثلاً جزیرۂ عرب، حدود سواد، نجد و حجاز، اور تہامہ کا جغرافیہ لکھنے کے بعد فتوحات اور ان کی کیفیت بیان کرنے کی طرف توجہ کرتا ہے۔ پھر ادیان کی باری آتی ہے اور اس کا آغاز عہد جاہلیت کے عربوں اور ان کے عقائد کی بحث سے کرتا ہے۔ پھر اشراف عرب اور ان کے پیشوں کا ذکر کرتا ہے۔ بیماریوں کی نوعیت اور ان کے اثرات کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد وہ ایام مشہورہ پر قلم اٹھاتا ہے، پھر اس کی توجہ ملوک حیرۃ و ملوک

Marfat.com

فارس کی طرف منعطف ہوتی ہے جس کو بیان کرنے کے بعد وہ اس کتاب کو ختم کر دیتا ہے۔

دینوری نے جس جس موضوع پر اپنے قلم کو اٹھایا ہے اس سے متعلق اصل ماخذ کو بھی استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ الانبیاء اور اسرائیلی مواد کے لیے بائبل کا بار بار حوالہ دیتا ہے[۱۷]۔ اس کے علاوہ وہب بن منبہ کا ذکر بحیثیت سند کے مذکور ہے[۱۸]۔ غالباً اس کی کتاب المبتدا کا نسخہ اس نے استعمال کیا تھا۔ جب وہ سیرۃ نبوی کے موضوع پر آتا ہے تو محمد بن اسحٰق کی سیرۃ ابن اسحاق سے واقعات نقل کرتا ہے[۱۹]۔ نیز واقدی کی کتاب المغازی اور ابن الکلبی کے بعض رسالے بھی اس کے پیش نظر ہوتے ہیں[۲۰]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ مواد کے حصول میں اصل ماخذ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ایرانیوں کی تاریخ لکھتے وقت وہ "کتاب سیر ملوک العجم" کو اپنی معلومات کے لیے بنیاد بناتا ہے[۲۱]۔ تاریخ اسلام کے موضوع پر قلم اٹھاتے وقت وہ بہت سے اخباریوں کی کتابوں کو اپنے پیش منظر رکھتا ہے۔ جو اس کے دور میں کوفہ و بغداد کے کتاب خانوں میں موجود تھیں۔

دینوری کی دوسری کتاب "عیون الاخبار" تین جلدوں میں مرتب کی گئی ہے۔ یہ اخلاقی کہانیوں، تاریخی واقعات، اور حکیمانہ اقوال پر مشتمل کتاب ہے۔ دیکھا جائے تو دراصل یہ اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کے متعدد پہلوؤں سے متعلق مواد فراہم کرتی ہے جس کو کئی ماخذ سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے اندر "سیر ملوک العجم" کا بھی حوالہ ملتا ہے[۲۳]۔ اس کتاب کا نسخہ غالباً مامون کی لائبریری سے حاصل کیا گیا تھا کیونکہ وہاں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایرانی کتابوں سے استفادے کا ثبوت نظر آتا ہے۔

Marfat.com

اس موقع پر یہ نکتہ خاص توجہ کا مستحق ہے کہ دینوری نے کتاب المعارف میں اسناد کی روایتی پابندی کو برتنے سے انحراف کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے فن تاریخ کو محدثین کے ایک اثر سے آزاد کرنے کی شعوری کوشش کی جس کی وجہ سے وہ محدثین کے عتاب سے بچ کر نکل بھی نہیں سکا اور حاکم نے اس کو کذاب تک کہہ ڈالا[۲۴] اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کے اندر غیر عقلی اور افسانوی عنصر کم پایا جاتا ہے۔ اس سے دینوری کے تاریخی نقطۂ نظر میں عقلیت کے زیادہ اثر کی تائید ہوتی ہے۔ تیسری بات جو کتاب پڑھنے سے فوراً ایک قاری کے ذہن میں ابھرتی ہے وہ یہ کہ دینوری عام طور پر واقعات کے انتخاب میں جانبداری سے کام نہیں لیتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دینوری نے اپنی "کتاب المعارف" کے ذریعہ عرب تاریخ نگاری کے دائرے کو نئی وسعت دے کر اس کو عالمی تاریخ سے اور قریب کر دیا اور اس طرح اس نے یعقوبی کی کوششوں کو اور تقویت پہنچائی۔ اسی طرز فکر کا ایک اور نمائندہ مورخ ابو حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری ہے۔ اس کی کتاب بھی اس فکر کا ایک اظہار ہے کہ عرب تاریخ دیگر اقوام وملل کی تاریخ سے علیحدہ وجود نہیں رکھتی بلکہ یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔

ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن ونند الدینوری اپنے زمانے کا مشہور لغوی گزرا ہے[۲۵] یہ صرف ونحو کا زبردست عالم تھا۔ اس کو ادب، فلسفہ، علم فلکیات اور تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کی مشہور تاریخ "کتاب اخبار الطوال" موجود ہے جو اس کے مورخ ہونے کا حقیقی ثبوت ہے۔ اس

کتاب پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مصنف اس تاریخ کے لیے ان ادوار کو منتخب کرتا ہے جن پر زیادہ سے زیادہ تاریخی مواد مل سکے چنانچہ اس اصول کی پابندی میں کتاب کے توازن کو بھی پیش نظر نہیں رکھ سکا اور ایرانیوں کی تاریخ کی طرف خصوصی توجہ دی ۔ وہ ایسے واقعات بھی بیان کرتا ہے جن کا تاریخ ایران سے براہِ راست تعلق ہو ۔ مثال کے طور پر وہ اسکندر پر جو مواد بھی فراہم کرتا ہے وہ تناسب سے زیادہ ہے ۔ اس نے ساسانیوں کی تاریخ پر بھی تفصیل سے مواد پیش کیا ہے ۔ اس کے بعد وہ فتح عراق کا حال درج کرتا ہے ۔ جس میں قادسیہ کی جنگ ، علیؓ معاویہ کی جنگ ، خارجیوں کی جنگ ، حضرت حسین کی شہادت ، ازارقہ کی بغاوت اور مقتل کی سرگرمی نیز زوال بنی امیہ سے متعلق واقعات شامل ہیں ۔ کتاب کا آخری حصہ علویوں کی سازش کے تذکرے اور خلفاء کی مختصر تاریخ پر مشتمل ہے ۔ ان موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنی خصوصیت کے اعتبار سے ایک خاص ذہن کے تحت لکھی گئی تھی ، جس کی ایک اہم خصوصیت انتخابی نقطۂ نظر ہے ۔ مواد میں عدم توازن کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ دینوری ایرانی النسل تھا اور شاید اسی وجہ سے اپنے ہم عصروں کے برخلاف یونان اور رومی تاریخ پر وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکا ۔

ابو حنیفہ نے مواد کے انتخاب میں جو رویہ اختیار کیا ہم اسے علمی رویہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس نے تاریخ کے انہیں ادوار کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے جس پر واقعی تاریخی مواد مل سکتا تھا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس کو متفقہ طور پر ثقہ تسلیم کیا[26] اور اس کی شخصیت کو نادرۂ روزگار بتایا ہے[27] ۔

ابو حنیفہ کی کتابوں میں سے صرف "کتاب اخبار الطوال" ہی محفوظ رہ سکی ہے ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ صرف مورخ ہی تھا اور

Marfat.com

کسی دوسرے علم سے اس کو دلچسپی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ماہر لسانیات اور عالم فلکیات بھی تھا۔ ان مضامین میں بھی اس نے کتابیں تصنیف کی تھیں لیکن بدقسمتی سے شاید وہ سب زمانے کے ہاتھوں ضائع ہوگئیں۔ علوم عقلیہ سے شغف کی بنا پر اس کا تاریخی شعور بھی متاثر ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں غیر عقلی مواد پیش کرنے سے احتراز کی کوشش کی جس میں وہ صحیح معنوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ ایسا مواد بھی تحریر کرتا ہے جو افسانوی ادب کا حصہ بن سکتا ہے۔

تیسری صدی کے آخر میں تاریخ کے مضمون سے دلچسپی عام ہو چکی تھی اور ایسی کتابیں جو علاقائی، شہری، خاندانی، اور محدود معنوں میں عالمی خصوصیات کی حامل تھیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اس صدی کے دیگر قابل ذکر مورخین میں حارث بن محمد بن ابی اسامۃ اور احمد بن ابی خیثمہ کے نام خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

حارث بن محمد بن ابو اسامۃ (۱۸۶ - ۲۸۲) کا ذکر اکثر محدث کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ اس نے ایک مسند بھی تیار کی تھی[۲۸] لیکن کسی تذکرہ نگار نے اس کا مورخ کی حیثیت سے ذکر نہیں کیا ہے۔ سب سے پہلے میرے علم کے مطابق ابن الاثیر نے اس کا بحیثیت مورخ اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ اس نے تاریخ دولۃ عباسیہ کے سلسلے میں حارث بن محمد کی کتاب کا ذکر کیا ہے[۲۹]۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اس نے بنی عباس کی تاریخ پر کوئی کتاب تصنیف کی تھی۔

احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب بن شداد (۲۰۵ - ۲۹۹) تاریخ و حدیث کے مشہور عالم گزرے ہیں[۳۰]۔ انہوں نے فن تاریخ پر ایک کتاب تصنیف کی تھی،

Marfat.com

جس کے اندر سند کی پابندی موجود تھی۔ کئی مورخوں نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ غالباً اس کا موضوع تاریخ عام رہا ہو اور اس نے تخلیق کائنات کے موضوع سے لے کر اپنے عہد تک کے حالات درج کیے ہوں۔ یہ اپنی کتاب کو عام طور پر براہِ راست روایت کرنے کی اجازت دیتے تھے، انہوں نے علم حدیث اپنے باپ یحییٰ بن معین، اور احمد بن حنبل سے حاصل کیا تھا۔ انساب کی معلومات کو حاصل کرنے کے لیے مشہور عالم معصب بن عبداللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ادب کی تعلیم مشہور ادیب محمد بن سلام الجمی سے اور ایام الناس کی تعلیم ابوالحسن المدائنی سے حاصل کی۔ ان ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے عہد کے نامور علمائے سے شاگردی کا موقع ملا۔ اس کے باپ زہیر بن حرب جو تاریخ واخبار کے عالم تھے بلاذری کے معتمد علیہ ساتھی گزرے ہیں۔ اس لیے احمد کی معلومات کے قیمتی، صحیح اور براہِ راست ہونے کا زبردست امکان ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر مورخین نے اس کتاب کو بہت سراہا ہے۔

عرب تاریخ نگاری ارتقائے کے متعدد مراحل کو طے کرتے ہوئے تیسری صدی میں اس منزل تک پہنچ چکی تھی کہ اب تک کے تمام تاریخی عناصر کا بھرپور اظہار کسی عالمی تاریخ نگار کی شخصیت کے ذریعہ ہو جو نہ صرف عرب تاریخ نگاری کی تمام خصوصیت کو اپنے اندر سمیٹ لے بلکہ اپنی ذہنی استعداد کو کام میں لاکر اس فن کو زیادہ علمی اور عالمی رخ دے سکے۔ چنانچہ ہمارے سامنے ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی شخصیت آتی ہے۔

ابوجعفر محمد بن جریر الطبری فن تاریخ اور فن تفسیر کے میدان میں مشہور عالم گزرے ہیں[۱۳]۔ قدرت نے جیسے تعلیم و تعلم کا ذوق ان کی فطرت میں

Marfat.com

ودیعت کر دیا تھا۔ چنانچہ عنفوان شباب ہی سے اپنی توجہ دینی اور تاریخی روایات کو جمع کرنے پر منعطف کردی تھی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے اکثر مشہور علماء سے جو مختلف ملکوں میں رہتے تھے رابطہ پیدا کیا تاکہ ان سے اپنی دلچسپی کے مضامین میں استفادہ کرسکیں۔ ان کے ذاتی کتاب خانوں سے فائدہ اٹھا سکیں اور اس کے علاوہ سماعت کے ذریعے ان سے مستفید ہوں۔ اس مقصد کے حصول میں طبری نے دور دور کے تعلیمی مرکزوں کا دورہ بھی کیا اور جب واپس لوٹے تو ان کے پاس معلومات کا بڑا خزانہ اکٹھا ہو چکا تھا۔ انہوں نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کیا اور اس کام سے ایسا چسکہ لگا کہ پھر کوئی مادی فائدہ راہ میں حائل نہ ہوا۔ دنیا سے بے نیازی اور علم سے یہ نیازمندی ہی ان کو اس قابل کرسکی کہ وہ اپنے آپ کو پوری یکسوئی کیساتھ قیمتی اور مفید تصنیفات کے لیے وقف کرسکیں۔ تاریخ، تفسیر، حدیث کے علاوہ بھی ان کو فن قرآت، ادب، نحو وصرف اور اخلاقیات کے مضامین میں دلچسپی تھی۔ حساب اور فن طب سے بھی شوق رکھتے تھے۔ مصر سے واپس آنے کے بعد کئی سال تک طبری، شافعی، فقہ کے پیرو رہے لیکن رفتہ رفتہ بعض قانونی مسائل پر اجتہاد کرنا شروع کیا اور اس طرح وہ ایک آزاد فقہی اسکول کے بانی ہو گئے۔ اس مکتب فکر کے ماننے والے جریریۃ کہلاتے تھے۔ چونکہ طبری نے شافعی اسکول کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیے بغیر جزئی مسائل پر آزادانہ رویہ اختیار کیا تھا اس لیے اس جدید فقہی خیال کو مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی اور شاید اسی بنا پر اس کا خاتمہ بھی جلد ہی ہو گیا۔ ابن جریر کو احمد بن حنبل سے بنیادی اختلاف تھا۔ وہ امام کو محدث تو مانتے تھے لیکن فقیہہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے احمد بن حنبل کے پیروکار

طبری سے بہت خفا رہتے اور بعض اوقات ان کی جان لینے کے درپے ہو جاتے۔ لیکن ابن جریر ہمیشہ فراخ دلی سے کام لے کر ان مخالفتوں کو منظر انداز کرتا رہا۔

ابن جریر طبری نے مختلف مضامین پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں جن کے نام یہ ہیں: الجامع البیان، عن تاویل آی القرآن، کتاب تاریخ الرسل والانبیاء والملوک والخلفاء، کتاب القرآت وتنزیل القرآن، الذیل المنزیل، کتاب التہذیب من مسند العشرۃ (مسند ابن عباس) کتاب آداب القضاۃ والمحاضر والسجلاۃ اور کتاب اختلاف علماء الامصار۔ مقدم الذکر کتاب معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ ہے جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے مصنف کے تبحر علمی، زبردست دماغ اور اعلیٰ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تفسیر میں روایتی طریقہ اختیار کیا ہے یعنی آیات کی تفسیر کرتے وقت وہ صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال اور آراء کو نقل کرتا ہے۔ اس طرح اس کا کام یہ ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت اپنے پیش روؤں کے اقوال کو سند کے ساتھ جمع کر دے اور بس۔ وہ کسی قول کی تحقیق و تنقید نہیں کرتا۔ شاید اسی وجہ سے اس کتاب کو علماء نے بہت پسند کیا اور اس کی شہرت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو گیا۔ پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کے اندر مصنف نے ذہنی اپج اور جدت سے کام نہیں لیا۔

یہ کتاب غالباً موجودہ ضخامت سے کہیں زیادہ بڑی تھی جیسا کہ ایک روایت اس بات کی تائید کرتی ہے۔ ابن جریر نے اپنے ساتھیوں سے ایک بار پوچھا، کیا تم لوگ میری تفسیر کا املاء لکھ سکتے ہو؟ لوگوں نے دریافت کیا کتنی ضخیم ہوگی؟ طبری نے جواب دیا کوئی تیس ہزار صفحات۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ اس کتاب کو نقل کرنے سے پہلے ہماری عمریں ختم ہو جائیں گی۔ اس کے

Marfat.com

بعد طبری نے اس کتاب کو تین ہزار صفحات میں مختصر کر دیا[۳۱] اس روایت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تفسیر کا اصل مسودہ یہ نہیں ہے جو ہمارے سامنے ہے بلکہ اصل نسخے کا خلاصہ ہے۔ اس تفسیر کو مرتب کرتے وقت مصنف نے ذیل کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ تفسیر ابن عباس، تفسیر سعید بن جبیر، تفسیر مجاہد بن جبیر، تفسیر قتادۃ بن دعامتہ، تفسیر حسن بصری، تفسیر عکرمتہ، تفسیر ضحاک بن مزاحم، تفسیر عبداللہ بن مسعود، تفسیر عبدالرحمٰن بن یزید، تفسیر ابن جریج، تفسیر مقاتل بن حیان۔

مصنف کی دوسری گرانقدر کتاب "تاریخ الرسل والملوک" یا "تاریخ الامم والملوک"، یا "اخبار الرسل والملوک"، تاریخ کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب ہمارے موضوع بحث سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ یاقوت الحموی کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی اصل کتاب کہیں زیادہ ضخیم تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ طبری نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا کہ تم لوگ تاریخ عام کی وہ کتاب جو آدم سے تا ایں دم کے حالات پر مشتمل ہے لکھ سکتے ہو؟ جواب میں لوگوں نے پوچھا کتنی ضخیم ہوگی؟ اس نے جواب دیا کوئی تیس ہزار صفحات، یہ سن کر شاگردوں نے کہا اتنی ضخیم کتاب نقل کرنے میں ہماری عمریں بھی ختم ہو جائیں گی۔ مصنف نے کہا "انا للہ لوگوں کی ہمتیں کتنی پست ہیں پھر اس نے کتاب کو تین ہزار صفحات میں مختصر کر دیا[۳۲]۔ بالکل یہی روایت الفاظ کے تھوڑے سے ردّو بدل کے ساتھ طبری کی تفسیر کے بارے میں بھی نقل کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنّف نے دونوں کتابوں کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کیا ہو اور دونوں موقعوں پر یہی ایک بات کہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے شاگردوں نے اس کے اس قول کو دونوں کی

Marfat.com

صورت حال میں یکسانیت کی بنا پر ایک دوسرے پر منطبق کر دیا ہو بہر صورت اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ کا مواد اس مواد سے دس گنا رہا ہوگا جو ہمارے پاس موجود ہے۔ نیز وہ نسخہ بھی جو طبری کی نگرانی میں تیار ہوا تھا وہی ہمارے پاس من و عن موجود ہے اس کے بارے میں بھی کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی بہت ممکن ہے کہ اس کے شاگردوں نے اس کے اندر حذف و اضافہ کیا ہو۔ اس شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کے دو نسخوں میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ سب سے اچھا اور مستند نسخہ وہ ہے جو یورپ سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن بھی مصر سے نکل رہا ہے۔

ابن جریر الطبری کی کتاب تاریخ الرسل کا آغاز ایک لمبی تمہید سے ہوتا ہے جس کے بعد تخلیق کائنات اور تخلیق آدم کے مسائل پر مواد پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کی زمانے کی نوعیت پر بحث خاصی مفصل ہے۔ اس کے بعد تاریخ الانبیاء کا حصہ ہے۔ اس حصے کی تیاری میں ابن جریر نے ان کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے جو اس کے پیش رو علماء نے اس موضوع پر تصنیف کی تھیں۔ بالخصوص وہب بن منبہ، ابن عباس اور ان کے تلامذۃ، اس کے علاوہ مصنف نے سیرۃ و مغازی کی کتابوں کے ان حصوں سے فائدہ اٹھایا ہے جن کا تعلق تاریخ الانبیاء سے تھا۔

تاریخ الانبیاء کے ساتھ ساتھ پرانے زمانے کے بادشاہوں اور پرانی قوموں کے مختصر حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس موضوع پر اس کا ماخذ یمنی روایات ہیں۔ اس موضوع پر بھی وہب بن منبہ کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے تاریخ یمن کے قدیم واقعات کو جمع کیا اور متعدد موضوعات پر کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ وہب کی وہ

Marfat.com

کتاب جو اس نے مسئلہ جبر پر تصنیف کی تھی اس کو عمر بن دینار نے مصنف کے گھر دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہب کی کتاب "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر واخبارہم وقصصہم واشعارہم"[34] بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے اندر وہب نے اپنی معلومات کو بغیر سند کے جمع کیا تھا۔ غالباً اسی کی مدد سے ابو محمد عبدالملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ نے "التیجان فی ملوک حمیر" مرتب کیا تھا۔ اس کی ایک اور کتاب کا نام "کتاب المتبدا" یا "المبدا" ہے جس کا موضوع ہی تخلیق عالم ہے۔ ابن ندیم نے اس کتاب کا مصنف عبدالمنعم ہی کو تسلیم کیا ہے[35]۔ لیکن عام طور پر یہ کتاب وہب بن منبہ کی سمجھی جاتی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس نے "زبور داؤد" کا ترجمہ کیا تھا۔ بہرحال وہب کی ممکن کتابوں سے ابن جریر نے اپنے اساتذہ کے ذریعے استفادہ کیا تھا۔ ان استاذوں میں محمد بن سہل بن عسکر البخاری ہیں جن کا انتقال ۲۵۱ھ میں ہوا۔ انہوں نے وہب کی معلومات اپنے استاذ اسمٰعیل بن عبدالکریم متوفی ۲۱۰ھ سے حاصل کی تھیں۔ ان کے تعلقات وہب کے خاندان سے بہت اچھے تھے۔ اسمٰعیل بن عبدالکریم نے وہب کے خاندان کے بہت سے افراد سے استفادہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے چچازاد بھائی ابراہیم بن عقیل کے علاوہ اپنے چچا عبدالصمد بن معقل سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں سے بھی فائدہ اٹھایا، جو یمن کے رہنے والے اور وہب کے ماننے والوں میں تھے۔ مثلاً عبدالملک بن عبدالرحمٰن الزماری اور علی بن الحسین جو وہب کے خاص ساتھی تھے[36]۔ ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ ہیں جنہوں نے وہب کی روایات کو تسلسل کے ساتھ طبری کو فراہم کیا۔ وہب کی معلومات کے

Marfat.com

علاوہ محمد بن اسحٰق کی تاریخ اور ہشام بن محمد الکلبی کی روایات اس حصے کی ترتیب میں معاون ہوئیں۔ مغازی ابن اسحٰق کا ایک حصہ تاریخ الانبیاء پر مشتمل تھا۔ ابن اسحٰق نے وہب، کعب الاحبار وغیرہ یہودی علماء اور ابن عباس کی روایات کو حاصل کر کے مرتب کیا تھا۔ طبری نے ابن اسحٰق کی کتابوں سے استفادہ اپنے کئی اساتذہ کے ذریعے کیا تھا۔

ابن جریر تاریخ الانبیاء، قدیم قوموں کے امراء اور بادشاہوں کے حالات بیان کرنے کے بعد ساسانیوں کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ اس حصے کی ترتیب میں اس کا بنیادی ماخذ ابن المقفع کی کتاب سیر ملوک العجم ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا براہِ راست حوالہ وہ اس حصے میں نہیں دیتا لیکن ایک غیر متعلق جگہ پر ایسا اشارہ ملتا ہے جس سے اس امکان کی تائید ہوتی ہے۔ ابن المقفع کے علاوہ جس شخص کا براہِ راست اور مسلسل ذکر تاریخ فارس کے بارے میں ملتا ہے وہ ابن الکلبی کی شخصیت ہے۔ چنانچہ ایسی روایات جن کا تعلق عرب و فارس کے باہمی تعلقات سے ہے اس کا بیشتر ماخذ ابن الکلبی ہے۔ ابن الکلبی نے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، جن کا ذکر ابن ندیم نے کیا ہے۔ لیکن افسوس ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کا تعین بہت مشکل ہے کہ طبری نے کس موقع پر کس کتاب کو استعمال کیا ہے۔

ایرانیوں کے ساتھ ساتھ یونان و روم کی تاریخ کے موضوع پر بھی طبری نے سرسری سی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان معلومات کے لیے ایک اہم ماخذ وہ ایرانی کتابیں ہیں جن کے اندر تاریخ روم سے متعلق کچھ معلومات درج تھیں اور جن کا براہِ راست ایران و روم کی تاریخ سے گہرا تعلق تھا۔ طبری نے

غالباً انہیں کتابوں کے ذریعے ان معلومات کو اکٹھا کیا تھا۔

فارس وروم کی تاریخ کے بعد طبری سیرت نبوی کو بیان کرتا ہے۔ یہ حصّہ خاصا طویل ہے اور مصنف نے بڑی تفصیل سے آنحضرت کے نسب سے لے کر وفات تک کے چھوٹے بڑے تمام واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس حصّے کا بیشتر مآخذ سیرت و مغازی کی وہ کتابیں ہیں جو پہلی صدی ھجری میں تصنیف کی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں عروۃ بن الزبیر، ابن شہاب الزہری، محمد بن اسحٰق، معمر بن راشد، واقدی اور محمد بن سعد جیسے جلیل القدر مورخین سیرت کی کتابوں اور روایات کو اس نے اپنا مآخذ بنایا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی قابلِ تعریف کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بہت سی نایاب کتابوں کے ٹکڑے زمانے کے دست و برد سے محفوظ رہ سکے۔ یہ ایسا گرانقدر کارنامہ ہے جس کو عرب تاریخ نگاری کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

سیرت نبوی کے بعد خلفاء راشدین کے حالات کا باب شروع ہوتا ہے جس میں طبری نے محمد بن اسحٰق، واقدی اور دیگر راویوں کے بیانات پر اعتماد کیا ہے۔ بعض روایات ایسی بھی ہیں جو اس نے براہِ راست اپنے اساتذہ سے حاصل کی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ اس نے ایسے علماء کی روایات کو آخذ بنایا ہے جو اس موضوع کے لیے مستند ترین مآخذ ہو سکتے تھے۔ ابن الاثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں طبری کی معلومات کو جو اس حصے سے متعلق ہیں مستند ترین قرار دے کر انہیں لفظ بلفظ نقل کیا ہے۔

اس کے بعد خلفاء بنی امیہ اور بنی عباس کا باب شروع ہوتا ہے۔ بنی امیہ کی تاریخ کے سلسلے میں بھی وہ مستند مآخذ کی طرف رجوع کرتا اور درجنوں اخباریوں کے رسائل اور کتابیں چھان بین اور تلاش کر کے استعمال کرتا

ہے۔ اس ضمن میں واقدی کی تاریخ الکبیر، ابو مخنف، عوانۃ بن الحکم کی کتابیں سیرت معاویۃ وبنی امیۃ، کتاب التاریخ اور سیف بن عمر اور مدائنی کی درجنوں کتابیں اس کا ماخذ رہی ہیں۔ ہیثم بن عدی کے رسائل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سب سے آخر میں بنی عباس کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس طرح یہ کتاب سنہ ۳۰۲ھ کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصنف نے سنہ ۲۹۵ھ تک کے واقعات تو تفصیل سے بیان کیے ہیں لیکن اس کے بعد جہاں سے اس کا خود اپنا دور شروع ہوتا ہے بہت اختصار سے کام لیا ہے چنانچہ کتاب کی آخری جلد جس میں ۳۷ سال کے حالات درج ہیں، وہ کل ۶۵۵ صفحات میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس دور کے حالات کے لیے اس نے دو طرح کے ذرائع معلومات کو استعمال کیا ہے زبانی اور تحریری۔ تحریری ذرائع میں احمد بن خیثمہ، عمر بن شبۃ، مدائنی، عمر بن راشد، ہیثم بن عدی اور دوسرے مورخین کی کتابیں ہیں۔ زبانی ماخذ میں اکثر ناموں کو ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے۔ وہ روایات جن کی سند کا ذکر نہیں پایا جاتا وہ اس طرح کی ہیں مثلاً "حدثنی جماعۃ من اہل طبرستان"[۴۷] "ذکران السبب ذالک"[۴۸] اور "وکان السبب فی ذالک فیما بلغنی"[۴۹] وغیرہ ہیں۔ وہ روایات جن کے راویوں کا ذکر کرتا ہے وہ اس طرح کی ہیں: "حدثنی ابو عبداللہ بن عبداللہ"[۵۰] "ذکر عن محمد بن داؤد بن الجراح"[۵۱] ابن جریر الطبری کی یہ شاندار کتاب اس کی موت سے ۸ سال پہلے تک کے واقعات یعنی سنہ ۳۰۲ھ پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔

چونکہ طبری تاریخ کے علاوہ فن حدیث سے بھی دلچسپی رکھتا تھا اسلیے

اس مضمون کی ایک اہم خصوصیت یعنی اسناد کی پابندی اس کے یہاں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر ایک ہی واقعہ کئی سلسلۂ سند سے مروی ہے تو وہ سارے سلسلوں کو بیان کرتا ہے۔ اس طریق بیان میں بڑی خامی یہ ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ اصل واقعہ سے ہٹ کر اسناد کے طویل سلسلے کی طرف ہو جاتی ہے۔ اس طرح پورا واقعہ ایک ہی مطالعہ میں سامنے نہیں آتا اور اس کی وحدت جاتی رہتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تو اس کی وحدت کا تصور نہیں پیدا ہوتا لیکن جب ٹکڑوں کو جوڑ دیا جائے تو ایک ہی نظر میں جسم کی وحدت نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ خامی اسناد کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے۔ تاہم دیکھا جائے تو اسناد کی پابندی سے انحراف طبری کے لیے خاصا مشکل بھی تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی محدث تھا اور غالباً وہ زمانے کے اس معیار سے انحراف بھی نہیں کر سکتا تھا۔

طبری بہت کم کسی معاملے میں اپنی رائے دیتا ہے۔ وہ کسی واقعہ کے سلسلے میں مختلف فیہ روایات کو نقل کر کے خود الگ ہو جاتا ہے اس کے بعد یہ قاری کا اپنا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کونسی روایت صحیح ہے اور کونسی غلط۔ اس طرح طبری ایک دیانتدار جامع تو ہے جو روایتوں کو بڑی محنت اور تلاش کے بعد جمع کر دیتا ہے لیکن وہ اس واقعہ کی صحت قائم کرنے کے بارے میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ غالباً یہی اس دور کی خوبی تھی جس کی بنا پر تمام لوگوں نے طبری کی کتاب کو ثقہ اور صحیح ترین تاریخی کتاب قرار دیا ہے[۲۴]۔

ابن جریر کی تاریخ میں ایسا مواد بھی ملتا ہے جو تاریخ کے دائرے میں نہیں آتا۔ مثال کے طور پر وہ شروع ہی میں "وقت" پر ایک لمبی بحث کرتا ہے جس کا تعلق تاریخ سے زیادہ فلسفے سے ہے۔ یہ تو میں نے ایک مثال

Marfat.com

دی ورنہ بیسیوں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو پوری کتاب میں پائی جاتی ہیں اور جن کا تاریخ کے مضمون سے براہِ راست کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کو پڑھنے سے ذہن یہ سوچنے لگتا ہے کہ مورخ کی اصل کتاب جو دس گنا بڑی تھی اس کے اندر کس قدر غیر متعلق مگر دلچسپ باتیں موجود رہی ہونگی نیز کتنی قیمتی باتیں ایسی ہیں جن سے ہم محض اس لیے محروم ہو گئے کہ مصنف کو اپنی کتاب مختصر کرنی پڑی۔

ابن جریر کی پوری کتاب پڑھنے کے بعد مواد کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو ایک خاص کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ کمی یہ ہے کہ مصنف نے مواد کو پیش کرنے میں توازن سے کام نہیں لیا۔ مواد میں عدم توازن کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک موضوع پر اتنی زیادہ معلومات فراہم کر دی جائیں کہ دوسرے موضوع پر طوالت کے خوف سے یا تو بہت مختصر اطلاع فراہم کی جائے، ورنہ سرے سے نظر انداز ہی کر دیا جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ طبری نے تاریخ الانبیاء پر جس قدر مواد فراہم کیا ہے وہ کافی سے زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف دورِ جاہلیت سے متعلق عربوں کی تاریخ پر کتاب میں بہت کم معلومات پائی جاتی ہیں، بلکہ اس کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس عہد کی عرب تاریخ کے ایک اہم حصہ یعنی "ایام" کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ خامی ذہن کو کھٹکتی ہے۔ اس کا شدید احساس مشہور مورخ ابن الاثیر کو بھی تھا جو طبری کا زبردست مداح اور خوشہ چیں گزرا ہے۔ اس حصے کو نظر انداز کرنے کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ طبری ایام کے اس مواد کو شاید لایعنی اور غیر تاریخی نوعیت کا سمجھتا تھا۔ اس صورت میں یہ خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ غیر تاریخی مواد کی بات تو ایسی نہیں ہے

Marfat.com

جو صرف ایام ہی پر صادق آتی ہو بلکہ تاریخ الرسل میں کئی مواقع پر ایسا مواد ملتا ہے جو کسی درجہ بھی ایام کے ادب سے بہتر، نہیں ہے۔ بالخصوص تاریخ فارس کا ابتدائی حصہ جس کو ہم پیشدادیہ اور اشکانیہ عہد سے یاد کرتے ہیں ان پر جو مواد پایا جاتا ہے وہ سب کا سب تاریخی اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ان کے اندر بھی قصہ اور خرافات کا بڑا حصہ موجود ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ایک ہی نوعیت کے مواد پر مختلف نقطۂ نظر اختیار کرنے کو کس بات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسری ممکن صورت یہ ہے چونکہ طبری ایرانی نسل سے تعلق رکھتا اور ایرانی علماء تاریخ عرب کے اس حصے کو خرافات کا درجہ دیتے تھے اس لیے طبری نے بھی شاید اس احساس کے تحت اس مواد کو نقل کرنے سے احتراز کیا۔ طبری جو تاریخ فارس سے اس قدر دلچسپی لیتا اور ایام سے ایسی بے توجہی برتتا ہے اس کا ایک مطلب شاید یہی نسلی احساس ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابن جریر نے بنی امیہ کی تاریخ کے اہم حصوں کو بھی بہت اختصار سے بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نکتے کی طرف ذہن جاتا ہے وہ یہ کہ ابن جریر نے تاریخ اسلام کے ایک نہایت اہم پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سے میری مراد اسپین کی تاریخ ہے۔ چنانچہ ابن جریر نے بنی امیہ کے فتح اسپین کے کارنامے کو صرف دو تین سطروں میں ذکر کیا ہے۔ یہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس موضوع پر کتابیں اور مواد نہیں ملتا تھا بلکہ اس موضوع پر کافی مواد پایا جاتا تھا۔ بلاذری کی فتوح البلدان کم از کم موجود ہی تھی۔ اس کے علاوہ مصر وغیرہ میں کئی مورخین نے اس موضوع پر کتابیں تصنیف کی تھیں۔ بہرحال یہ اہمال مصنف کی کتاب کو کم از کم توازن کے معیار سے گرا دیتا ہے۔

Marfat.com

ابن جریر نے اپنے عہد کے حالات کو نہایت ہی اختصار سے تحریر کیا ہے ۔ یہ اختصار بعض جگہوں پر تو کھٹکتا ہے ۔ مثلاً ۲۹۲ھ سے ۳۰۲ھ تک کے حالات بہت ہی مختصر طریقے سے بیان کیے گئے ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ واقعات کو تحریر کرنے سے بچتا ہو ۔ اس کی غالباً ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہم عصر واقعات کو بیان کرنے سے قصداً احتراز کرتا اور انہیں مصلحتاً چھپاتا تھا ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ان ہم عصر واقعات کے جنہیں درج بھی کرتا ہے زبانی ماخذ کا ذکر نہیں کرتا ۔

ابن جریر الطبری نے اپنی تاریخ میں جو مواد فراہم کیا ہے اس کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ نسبتاً زیادہ قابل اعتماد ہے ۔ کیونکہ مصنّف نے حتی المقدور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنے ماخذ ایسے اشخاص اور کتابوں کو بنائے جو مستند اور قدیم ترین اہمیت کے حامل ہوں ۔ یہ رائے بالخصوص ان حصّوں کے بارے میں صحیح ہے جو اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار پر مشتمل ہیں ۔ آنحضرتؐ کی سیرت، خلفاء راشدین کے حالات یقیناً ایسے مواد پر مشتمل ہیں جو براہِ راست قدیم ترین ماخذ سے حاصل کیے گئے ہیں ۔

مجموعی طور پر مواد میں بعض خامیوں کے باوجود جس کی طرف میں اشارہ بھی کر چکا ہوں طبری کی کتاب اس کی بے مثال قوتِ حافظ اور طاقتور دماغ کی شاندار نشانی ہے ۔ اس نے اپنی انتھک سرگرمیوں کے ذریعے معلومات کا وسیع اور بیش بہا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے ۔ پرانے مسودات، ریکارڈ اور دستاویزوں کو حاصل کیا، درجنوں اساتذہ کی مدد حاصل کی ان سب کے ذریعہ معلومات کو اکٹھا کرنے کے بعد انہیں چھانٹا، مستند کو غیر مستند سے، قوی کو ضعیف سے اور صحیح کو غلط سے علیٰحدہ کیا ۔ اس طرح یہ ممکن ہو سکا کہ ہم اسلام تاریخ کے

نہایت اہم ادوار کی معلومات سے آشنا ہوں اور قدیم ترین تحریری مواد کے نہایت ہی قیمتی نمونے ہم تک پہنچ سکیں۔ اس بنا پر ہم یہ بات نہایت سچائی سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب عرب تاریخ نگاری کے فن میں گرانقدر اضافہ ہے۔ چنانچہ یہ عظیم الشان کتاب اگر دوسری کتابوں کی طرح زمانے کے ہاتھوں برباد ہو جاتی تو عرب تاریخ نگاری کی رفتار کا پس منظر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور اس کے قدیم ترین نمونے ہم تک نہ پہنچ پاتے۔

تاریخ الرسل والملوک کا ترجمہ بہت جلد دوسری زبانوں میں بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ امیر ابو صالح منصور بن احمد بن اسمٰعیل بن سامان کے حکم سے ۳۵۲ھ میں مشہور ادیب ابو علی محمد بن عبداللہ البلعمی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ مترجم دولۃ سامانیہ میں نامور وزیر بھی رہ چکا ہے۔ اس کا انتقال چوتھی صدی کے نصف آخر میں ہوا[۲۲]۔ فارسی ترجمہ کی بنیاد پر اس کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ ہوا۔ یہ کام امیر الامراء احمد پاشا کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد ایک اور ترجمہ ترکی زبان میں دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں ہوا ہے[۲۳]۔

ابن جریر الطبری بہت اونچے پائے کا مورخ گزرا ہے۔ وہ اصل ماخذ کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے لیکن اپنے اس عمل میں وہ ایک زبردست جامع اور مرتب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ قاری کے سامنے معلومات کا وسیع خزانہ سچائی اور ایمانداری سے پیش کر دیتا ہے۔ اب یہ مطالعہ کرنے والے کا کام ہے کہ وہ رطب ویابس میں فرق کرے۔ لیکن اس جمع وتدوین کے کام میں اس کے یہاں تنقیدی صلاحیت

Marfat.com

کا اندازہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ ایک زبردست جامع، عظیم مورخ کی حیثیت کا مالک ہے جس نے نہ صرف عرب تاریخ نگاری کے سرمائے میں لافانی اضافہ کیا بلکہ تاریخ عالم کے ادب میں اس کی کتاب کا ایک اہم اور مستقل مقام ہے۔

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ بلاذری کی سال پیدائش معلوم نہیں۔ تذکرہ نویس اس مسئلہ پر خاموش ہیں۔ اس کا نام احمد اور کنیت ابوالحسن تھی۔ اپنی تعلیم کا ایک حصہ دمشق اور حمص میں مکمل کیا۔ پھر وہ عراق چلا گیا جہاں بغداد میں ابن سعد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کی۔ اس کا دادا جابر مصر کے حکمراں خصیب کا سکریٹری رہ چکا تھا۔ بلاذری عرب تھا یا نہیں اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے اس کو ایرانی النسل اس لیے تسلیم کیا ہے کہ وہ فارسی سے عربی میں کتابیں ترجمہ کرتا تھا۔ اس مسئلہ سے قطع نظر کہ وہ کس نسل سے تھا اس کا وسیع المشرب اور نسلی عصبیت سے بلند ہونا عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلاذری نے اپنے دور کے تمام بڑے بڑے مورخین سے ملاقات کر کے ان سے استفادہ کیا۔ یاقوت الحموی کا خیال ہے کہ اس نے واقدی، مدائنی سے ملاقات کی تھی اس کے علاوہ مشہور اخباری زبیر بن حرب بن شداد متوفی ۲۳۴ھ اس کے دوستوں میں تھا۔ چنانچہ بلاذری نے ان کی معلومات کو اپنی کتاب الانساب میں جگہ دی ہے۔ جب اس کا انتقال ۲۷۹ھ میں ہوا تو وہ دماغی عدم توازن میں مبتلا تھا۔

ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص۱۱۳، یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۲ ص ۱۲۷۔۱۳۲۔ BROCKELMANN. S. 1/216.

۲- ENCY. OF ISLAM, VOL. I. P. 611-612.

۳- بلاذری کی انساب الاشراف کا صرف چوتھا اور پانچواں حصہ اب تک شائع ہوا ہے۔ اگر پوری کتاب شائع ہو جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرے مورخین نے کہاں تک اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ میری ملاقات ایک نوجوان یہودی عالم سے ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس کے ایک استاذ عبرانی یونیورسٹی میں بلاذری پر کام کر رہے ہیں جو انساب کی باقی جلدوں کو بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ محمود۔

۴- احمد بن ابی یعقوب کی تاریخ پیدائش مذکور نہیں۔ اس کے اجداد میں واضح صالح کا غلام تھا جس کو اس نے آزاد کر دیا تھا۔ خلیفہ منصور سے بھی اس کے مراسم تھے جس نے اس کو آزادی کا پروانہ دیا تھا۔ یعقوبی نے اپنی جوانی کا زمانہ آرمینیہ اور خراسان میں گزارا جہاں ظاہری امراء کے دربار میں سکریٹری کے عہدے پر عرصے تک کام کرتا رہا ہے۔ مگران کی حکومت ختم ہونے کے بعد وہ مصر چلا گیا جہاں اس کا ۲۸۴ھ میں انتقال ہو گیا۔

یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۱ ص ۱۵۶-۱۵۷،

۵- یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۱ ص ۱۵۷

۶- ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۳۰۵-۳۰۶

۷- ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۳۰۵-۳۰۶

۸- الاصفہانی۔ تاریخ سنی ملوک الارض ص ۶۷

۹- ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۳۱۱

۱۰- " " ص ۲۷۷

۱۱- BROCKELMANN. S.I. P. 395

۱۲- الاصفہانی۔ کتاب سنی ملوک الارض ص ۶۹

Marfat.com

۱۳۔ ابو معشر کی بعض اہم کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ان میں سے "کتاب المدخل الکبیر الی احکام النجوم"، کا آگسبرگ سے ۱۴۸۹ء میں طبع ہوا اور دوسری کتاب "کتاب القرانات"، وینس سے ۱۵۱۵ء میں طبع ہوئی۔

۱۴۔ ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری ۲۱۳ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی جائے پیدائش مشہور علمی مرکز کوفہ ہے۔ اسی شہر میں اس نے تعلیم حاصل کی اور غالباً عنفوان شباب تک یہیں قیام بھی رہا۔ اس نے عربی زبان و ادب میں کمال پیدا کیا۔ نیز اس کو اخبار و ایام سے خاص دلچسپی تھی جس پر اس نے بہت سی معلومات جمع کر لیں تھیں۔ فقہ بھی اس کا موضوع تھا اور اس پر درک رکھنے کی وجہ سے وہ دینور کا قاضی بھی مقرر ہوا۔ اس نے اسحٰق بن راہویہ اور ابو حاتم السجستانی سے حدیث کی سماعت بھی کی تھی۔ بیہقی نے اس کو کرامی خیالات کا حامل قرار دیا ہے۔ دارقطنی نے اس کو ذات الٰہی کے بارے میں تشبیہی عقیدے کا نمائندہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ دینوری نے اس الزام کی تردید میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا تھا۔ مجموعی طور پر محدثین نے اس کو ضعیف اور مورخین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ اس کی موت گیہوں اور گوشت سے بنے ہوئے ایک کھانے کی وجہ سے ہوئی۔ جب اس نے اس کو کھایا تو بیمار پڑ گیا اور صبح ہوتے ہوتے اس کا انتقال ہوگیا۔ سیوطی نے اس کا سال وفات سنہ ۲۷۰ھ تحریر کیا ہے۔

سیوطی۔ بغیۃ الوعاۃ ص ۲۶۷ ENCY. OF ISLAM. VOL 2. P. 399

۱۵ کتاب المعارف کے یورپین ایڈیشن کو مشہور مستشرق ویسٹنفیلڈ نے اڈٹ کیا اور لائڈن سے ۱۸۵۰ء میں طبع ہوا۔

۱۶۔ عیون الاخبار کو تین جلدوں میں بروکلمان نے اڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔

۱۷۔ دینوری۔ کتاب المعارف ص ۱۲

Marfat.com

۱۸۔ دنیوری۔ کتاب المعارف صد ۲۰۶

۱۹۔ " صد ۷

۲۰۔ " " صد ۵۹

۲۱۔ " " "

۲۲۔ " " صد ۳۲۰

۲۳۔ " عیون الاخبار ج ۱ صد ۱۸ ج ۲ صد ۱۴۶-۲۱۶ ج ۳ صد ۳۸۴

۲۴۔ سیوطی بغیۃ الوعاۃ صد ۲۶۷

۲۵۔ احمد بن داؤد ابو حنیفہ کی پیدائش غالباً تیسری صدی کی پہلی چوتھائی میں ہوئی تھی۔ وہ عراق کے مشہور مردم خیز شہر دنیور میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کوفہ چلا گیا جہاں اس نے السکیت سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور نحوی وصرفی عالم گزرے ہیں۔ بعد میں ابن السکیت کی شاگردی اختیار کی۔ اس نے بصرۃ جاکر وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ ۲۳۵ھ میں وہ اصفہان چلا گیا جہاں فلکیات کے مضمون پر دستگاہ پیدا کی۔ یہاں کے دوران قیام میں اس نے جو نتائج اخذ کیے اس کو اپنی کتاب "کتاب الرصاد" میں تحریر کیا۔ یاقوت الحموی نے اس کو نحوی۔ لغوی، ہندسی اور منجم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ حساب کا ماہر تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ دنیور چلا گیا جہاں اپنی باقی زندگی گزار دی۔ اس نے دنیور ہی میں ایک ترقی یافتہ رصدگاہ بھی تعمیر کرائی تھی جو صدیوں تک مشہور رہی۔ اس کا انتقال سنہ ۲۸۲ھ میں ہوا۔ اس نے دوسری متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں کتاب الانواء، کتاب النبات، تفسیر القرآن، الشعر والشعراء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یاقوت الحموی — ارشاد الاریب ج ۱ صد ۱۲۳-۱۲۷ خیر الدین الزرکلی الاعلام

Marfat.com

BROCKELMANN. S. I, P. 187 ج ۱، ص ۱۱۹

ENCY. OF ISLAM. VOL. I, P. 977-78.

۲۶۔ ابن ندیم ۔ کتاب الفہرست ص۲۸۷ یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۱ ص ۱۳۷

۲۷۔ سیوطی ۔ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۲

۲۸۔ ذہبی ۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۵

۲۹ ابن الاثیر ۔ تاریخ الکامل ج ۶ ص ۱۶۱

۳۰ احمد بن ابی خیثمہ ۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے تھے ۔ ذہبی ۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۶ ذہبی ۔ لسان المیزان ج ۱ ص ۱۷۴ ، یاقوت الحموی ۔ ارشاد الاریب ج ۱ ص ۱۲۸ ، حاجی خلیفہ ۔ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۷۶

۳۱۔ ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید بن کثیر بن غالب الطبری ۲۲۴ھ کے آخری ماہ یا ۲۲۵ھ کی ابتدا میں پیدا ہوئے ۔ ان کی پیدائش صوبہ طبرستان کے ایک مشہور شہر آمل میں ہوئی تھی ۔ ان کے باپ بڑے دولتمند تھے ۔ اس لیے ان کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا ۔ قدرت نے انہیں بلا کا قوتِ حافظہ بھی دیا تھا ۔ بڑی کم عمری ہی میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے ، اس کا ثبوت یہ ہے کہ غالباً ۷ سال میں انہوں نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا ۔ اپنے شہر میں ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے باپ سے اجازت لے کر مسلم ملکوں کے علمی مراکز دیکھنے کا قصد کیا ۔ باپ نے پوری تیاری کے ساتھ بیٹے کو روانہ کیا ۔ یہاں سے وہ ری پہونچے اور قرب و جوار کے علمائے سے استفادہ کیا ۔ یہاں سے بغداد آئے جہاں تھوڑے ہی عرصے پہلے احمد بن حنبل کا انتقال ہو چکا تھا جن سے طبری کو استفادے کا بڑا شوق تھا ۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد انہوں نے مصر جانے کا ارادہ کر لیا اور شام کی طرف نکل کھڑے ہوئے ۔ شام کے مختلف

Marfat.com

شہروں میں قیام کرتے رہے اور علماء سے علوم کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مصر پہنچنے سے پہلے ان کی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی چنانچہ جب وہ مصر پہنچے تو انہیں لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بغداد واپس آئے تو آخر عمر تک یہیں قیام کیا۔ بیچ میں دوبار وہ اپنے وطن طبرستان گئے تھے۔ ان کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا اور انہیں ان کے گھر ہی میں دفن کر دیا گیا۔

ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۳۳۴-۳۳۵ھ، ابن الخطیب، تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۶۲-۱۶۹ ذہبی۔ تذکرۃ الحفاظ، ج ۲ ص ۱۶۰-۱۶۷ھ، یاقوت الحموی، ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۳۲-۴۶۲، سبکی، طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵-۱۳۶، ابن العماد، شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۶، ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۳۲ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ ص ۱۴۵-۱۴۷، طاش کبری زادہ۔ مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۰۵-۲۰۶، حاجی خلیفہ کشف الظنون ج ۱ ص ۲۳۷، ابن الاثیر، تاریخ الکامل، ج ۸ ص ۴۲،

۳۲۔ یاقوت الحموی۔ ارشاد الاریب ج ۶ ص ۴۲۶

۳۳۔ " " " "

۳۴۔ ابن خلکان۔ وفیات الاعیان ج ۲۔ ص ۲۳۸

۳۵۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست ص ۱۳۸

۳۶۔ ڈاکٹر جواد علی۔ موارد تاریخ الطبری۔ مجمع العلمی العراقی ۱۹۵۲ء

۳۷۔ ابن جریر الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۱۲ ص ۱۵۲۴

۳۸۔ " " " " ص ۱۵۳۵

۳۹۔ " " " " ص ۲۲۵۶

۴۰۔ " " " " ص ۱۵۰۲

Marfat.com

۱۴۔ ابن جریر الطبری ۔ تاریخ الرسل والملوک ج ۱۲ ص ۲۲۹۴

۴۲۔ ابن خلکان ۔ وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۳۲

۴۳۔ ڈاکٹر جواد علی ۔ موارد تاریخ الطبری ۔ مجمع العلمی القرآنی سنہ ۱۹۵۰ء

۴۴۔ " " " "

Marfat.com

پانچواں باب

فکر و فن: ایک جائزہ

کسی واقعہ یا حادثے کا وقت اور مقام سے لازمی تعلق ہوتا ہے، اسی لیے کوئی بھی واقعہ ہو یا حادثہ وقت سے باہر اس کے وقوع کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ جب کسی واقعہ یا حادثہ کو زبانی طور پر بیان کیا جائے یا اسے تحریری صورت میں لایا جائے تو وقت کا سوال فوراً ذہن میں ابھر کر آتا ہے۔ یعنی وہ خاص واقعہ یا حادثہ کس وقت اور مقام پر وجود میں آیا تھا۔ بالخصوص تاریخی اہمیت کے واقعات یاد کرنے یا انہیں تحریری شکل دیتے وقت یہ مسئلہ خاص اہمیت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وقت اور مقام کی اس حیثیت کو نظر انداز کر کے تاریخی واقعات کو ضبط تحریر میں لایا ہی نہیں جاسکتا بلکہ اس نکتہ پر توجہ دیتا ہے کہ وقت اور مقام کا کسی خاص واقعہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر تاریخی واقعات کو یاد کرتے یا تحریر کرتے وقت ان دونوں باتوں کا ضرور لحاظ رکھا جاتا رہا ہے اور اس طرح وقت اور مقام کا شعور ترتیب واقعات کی تہہ میں کارفرما رہا ہے۔

وقت اور مقام کے اس اصول کی روشنی میں اگر ہم عربوں کے

تاریخی مواد کی ترتیب و تدوین پر غور کریں اور اس پہلو سے اس مسئلے کا جائزہ لیں تو اس بات کی تائید آسانی سے کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے تاریخی واقعات کی تدوین میں وقت اور مقام کی حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اسے برتا بھی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے وقت کے تعین کے لیے دونوں طریقوں کو اپنایا۔ یعنی ایک طریقہ تو وہ ہے جس کو ہم "ترتیب زمانی" اور انگریزی میں "CHRONO LOGICAL ORDER" کہتے ہیں۔ اس طریقے کے تحت واقعات کو بغیر ماہ و سال کا تذکرہ کیے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس طریقے میں واقعات کو زمانۂ وقوع کی ترتیب کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر ہم کسی واقعے کے اس سال کا پتہ لگانا چاہیں جس میں یہ ہوا تھا تو بہت مشکل ہوگا نہ ہی یہ پتہ چلانا آسان ہوگا کہ دو یا اس سے زیادہ واقعات کے مابین کتنی مدت پائی جاتی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر واقعہ کے واقع ہونے کے سال اور مدت کا ذکر کیا جائے۔ اس طریقے کو "ترتیب سن"، یا انگریزی میں "ANNALI-STIC ORDER" کہتے ہیں۔ اس اصول کو اپنانے میں یہ خوبی ہے کہ واقعات کا زمانے سے جو رشتہ ہوتا ہے وہ متعین طور پر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ زیادہ علمی طریقہ ہے اور اس کی مدد سے واقعات کے مابین اس منطقی رشتے کو ڈھونڈھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے جس سے خود واقعات کی معنویت پر بعض اوقات اثر پڑتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو عرب تاریخ نگاری کے فن میں ان دونوں اصولوں کو برتا گیا ہے۔ ترتیب زمانی کے سلسلے میں عربوں کا وہ نیم تاریخی خام مواد جو اسلام کے ماضی بعید یا قریب سے تعلق رکھتا ہے مثال کے طور پر پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ ان کو

Marfat.com

یاد کرتے یا تحریری شکل میں لاتے وقت انہوں نے ترتیب زمانی کے اصول کو اپنایا ہے۔ اس کے برخلاف وہ تاریخی سرمایہ جس کا تعلق صدر اسلام سے ہے اس کی ترتیب میں اگرچہ عام طور پر ترتیب زمانی کے اصول کو اپنایا گیا ہے لیکن اس حصّے میں ایک نیا عنصر جو دیکھنے میں آیا ہے وہ یہ کہ ہر واقعہ کے لیے علیحدہ علیحدہ سرخی قائم کرنے کے ساتھ ساتھ واقعات کے سن وقوع کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سن ہجری کے ذریعے موقت کیا جاتا ہے مثال کے طور پر سیرت و مغازی کے حالات بیان کرتے وقت زمانی ترتیب کی پابندی کی گئی اور ساتھ ہی ماہ و سال کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تاریخی واقعات کو تحریر کرنے کا یہی طریقہ صدر اسلام میں عرصے تک جاری رہا۔ چنانچہ سیرت کے علاوہ فتوح واحداث کے موضوع پر لکھے جانے والے رسالے بھی بنیادی طور پر ترتیب زمانی کی پابندی کرتے تھے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں ہے کہ ترتیب زمانی کے اصول کے تحت تاریخی واقعات اور حالات کو لکھنے کا رواج مختلف قوموں میں بہت پرانا ہے۔ اس کی تصدیق قدیم اقوام کے تاریخی مسودات کا مطالعہ کرنے سے ہوتی ہے۔ عربوں کے قریب ترین پڑوسی جو علم و فن میں بہت آگے تھے اور جن سے ان کے مراسم نا معلوم زمانے سے تھے یعنی اہلِ فارس ان کے یہاں تاریخی واقعات کو ترتیب زمانی کے تحت مرتب کرنے کا رواج موجود تھا۔ اس بات کی تصدیق ان کتابوں سے ہوتی ہے جنہیں پہلوی زبان سے عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ یہ کتابیں جو عہد عباسی میں ترجمہ ہوئی تھیں عرصے تک موجود رہیں۔ مگر ان کتابوں کے

Marfat.com

ترجمے سے بہت پہلے عربوں میں ترتیب زمانی کے تحت واقعات تحریر کرنے کا رواج موجود تھا۔ انہوں نے اس میں جدّت یہ پیدا کی کہ اپنے تہذیبی ارتقاء کے بالکل شروع ہی میں واقعات کو وقت سے زیادہ متعین ربط دینے کے لیے سن ہجری کو اپنا لیا۔ ظاہر ہے یہ جدّت عربوں کے تاریخ نگاری کے اصول میں ایک نہایت ہی قیمتی اضافہ تھا۔

سن ہجری کے خیال کو عربوں نے اپنی نئی تاریخی زندگی کے بالکل ابتدائی عہد میں پا لیا تھا۔ یعنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں خطوط، دستاویز اور دیگر سرکاری کاغذات کو سن سے مربوط کرنے کے لیے سن ہجری کے اجراء پر اتفاق عمل میں آیا۔ عام طور پر یہ روایت تسلیم کی جاتی ہے کہ ایک بار ۱۶ھ ہجری میں حضرت عمرؓ کے سامنے ایک چیک پیش کیا گیا۔ اس چیک پر صرف ماہ شعبان کا لفظ درج تھا۔ اس کو پڑھ کر حضرت عمرؓ نے کہا "کیسے پتہ چلے کہ شعبان کس سال کا ہے؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے اہل فکر کا ایک اجلاس بلایا گیا جس میں کئی بڑے صحابہ نے شرکت کی۔ شرکاء کی اکثریت نے اہلِ ایران کے سن تقویم کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ اسی وقت نو مسلم بادشاہ ہرمزان جو مدینے میں مقیم تھا وہ بلایا گیا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے یہاں جو طریقہ رائج ہے اس کو ماہ و روز کہتے ہیں جس میں ماہ اور تاریخ دونوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس سوال پر گفتگو ہوئی کہ سن کی ابتداء کب سے قرار دی جائے۔ حضرت علی نے ہجرۃ نبوی کے واقعہ کو تجویز کیا جس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ چونکہ آنحضرت ﷺ نے ربیع الاوّل میں ہجرت کی تھی اور عربوں کے یہاں سال کی ابتداء محرم کے مہینے سے ہوتی تھی اس لیے دو ماہ آٹھ دن پیچھے ہٹ کر شروع سال سے سن ہجری کا آغاز ہوا[1]۔ اس روایت

1- SHORTER ENCYCHOLOPAEDIA OF ISLAM P 578-579,

سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں میں زمانۂ اسلام سے بہت پہلے بھی ماہ کا تصوّر پایا جاتا تھا اور سن کا رواج بھی موجود تھا۔ لیکن موخرالذکر سوال پر کسی ایک متعین تقویم کی پابندی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس کے لیے کئی طریقے مروج تھے۔

ایک متعین تقویم کو اپنانے کا خیال ظاہر ہے انتظامی اور دیگر مشکلات پیش آنے کی صورت میں پیدا ہوا اور جب دشواری پیش آئی تو اس پر غور کرنے کے بعد ہی ایک اصول منتخب کیا گیا۔ اس لیے اس خیال میں وزن نہیں رہ جاتا کہ عربوں کو ترتیب سنین کے اصول اپنانے کی محرک وہ تاریخ نگاری کی روایت ہوئی جو شام اور فارس میں صدیوں سے قائم تھی اور جس کی طرف اوزنتھال نے تشکیک انگیز اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، "بازنطینی ادب میں ترتیب سن کے تحت لکھی ہوئی کتابوں کا وجود مسلم ہے اس سلسلے میں مشہور مورخ "جان ملالا" کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے جس نے اپنے عہد کی تاریخ ترتیب سن کے تحت مرتب کی تھی(۱)"۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں ایسے متعدد عیسائی علماء گزرے ہیں جنہوں نے نہ صرف اس فن میں مستقل کتابیں تصنیف کیں بلکہ یونانی زبان سے سریانی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ مثال کے طور پر یوسیبیس کی تاریخ کو شمعون نے ساتویں صدی کے آغاز میں سریانی زبان کا لباس پہنایا تھا(۲)۔ جان ایفیسیں جو چھٹی صدی کا مورخ ہے اس نے کلیسا کی تاریخ کو ترتیب سن کے تحت تین حصوں

---

(1) F. ROSENLHAL - A HISTIRY OF MUSLIM HISTORIOGRAP-
-HY. P 66-67

(2) O'LEARY- HOW GREEK SCIENCE AND THOUGHT PASSED TO THE ARABS. P-71

Marfat.com

میں تصنیف کیا تھا[1] اس کے علاوہ پروکوپیس جو چھٹی صدی کا فلسطینی مورخ گزرا ہے اس نے فن تاریخ پر کتاب تصنیف کی تھی[2] ظاہر ہے شام کے علمی مرکزوں میں ان کتابوں کے موجود رہنے کا خیال صرف قیاس کی حد تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں یقین کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ چوتھی، پانچویں، اور چھٹی صدی عیسوی میں شام علمی نشاۃ ثانیہ کا زبردست مرکز تھا۔ اس کے جو اسکول انطاکیہ، بیروت، صیدا اور نصیبین میں موجود تھے ان سے مشہور قانون داں، نامور مورخ اور آزاد خیال مفکر پیدا ہو رہے تھے[3] جب ساتویں صدی میں عربوں نے اس علاقے کو اپنے قبضے میں کیا تو اس کے انتظامی، عدالتی اور مالی امور عرصے تک یونانی زبان کے ذریعے انجام پاتے تھے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ قیاس باوزن ہو جاتا ہے کہ شاید عربوں نے ترتیب سن کے اصول کو اپنے عیسائی پڑوسیوں سے سیکھا ہو۔ لیکن ایک طرف تو یہ قوی امکان ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا دوسری طرف وہ تحریری شواہد ہیں جو اس ارتقاء کا متعین پتہ دیتے ہیں جو تقویم سن کے معاملے پر عربوں کے یہاں ہوا تھا۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر ترتیب سن کے اصول کو سب سے پہلے کب اور کس نے اپنی تصنیف میں استعمال کیا عرب

---

(1) IBID. P 90

2 WILL DURANT - THE STORY OF CIVILIZATION. VOL. 4 P. 125

3 WILL DURANT - THE STORY OF CIVILIZATION P. 132.

Marfat.com

تاریخ نگاری کے جو نمونے ہمارے پاس ہیں ان پر بغائر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلی کتاب جو اس اصول کے تحت لکھی گئی اور جو موجود بھی ہے وہ ابن جریر طبری کی تاریخ الرسل والملوک ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ طبری سے پہلے کسی اور مورخ نے اس اصول کو برتا ہی نہیں بلکہ ہمارے پاس ایسے دلائل ہیں جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ بعض دوسرے مورخین نے بھی اس اصول کو اپنی تصنیف میں اپنایا تھا۔ اگر ہم ابن ندیم کی الفہرست کے اس حصے پر نظر ڈالیں جن میں علماء اور مورخین کا تذکرہ ہے تو ایک بڑی تعداد ایسے مورخین کی ملے گی جنہوں نے تاریخ کے سرمائے میں کوئی نہ کوئی اضافہ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کتابوں کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی درج کر دی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہیثم بن عدی پہلا مورخ ہے جس نے اپنی ایک کتاب میں ترتیب سن کے اصول کو استعمال کیا تھا۔ ہیثم کا انتقال ۲۰۶ھ ہجری میں ہوا تھا۔ جس کتاب میں ترتیب سنین کے اصول کو برتا تھا اس کا نام "کتاب التاریخ علی السنین" لکھتا ہے۔[۱] کتاب کے عنوان ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ترتیب سنین کے تحت مرتب کیا گیا تھا۔ مگر یہ کتاب ناپید ہے۔ اس کے بعد دوسرا شخص جس کا نام ملتا ہے وہ جعفر بن محمد بن الازہری ہے۔ اس نے بھی ایک کتاب "کتاب التاریخ علی السنین" کے نام سے تصنیف کی تھی۔[۲]

۱۔ ابن ندیم۔ کتاب الفہرست صہ ۱۴۶

۲۔ ازہری کی سال پیدائش ۲۰۰ھ ہجری اور سال وفات ۲۹۷ھ بیان کی جاتی ہے۔ الفہرست صہ ۱۴۶

یہ کتاب بھی موجود نہیں ہے۔ یاقوت الحموی نے اس کا ذکر کیا ہے ۱ ازہری کا انتقال ۲۹۷ھ میں ہوا یعنی طبری سے ۱۳ سال بیشتر۔ اس طرح یہ شخص ابن جریر کا ہم عصر ہی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں شہادتوں کی موجودگی میں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ابن جریر پہلا مورخ نہیں ہے جس نے اس اصول کو پہلی بار اپنی کتاب میں برتا ہو۔ بلکہ اس سے پہلے کم از کم دو مصنف ایسے گزر چکے ہیں جنہوں نے اس اصول یعنی ترتیب سنین کے تحت کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس موقع پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں کے علاوہ یا ان سے پہلے بھی کسی اور شخص نے اس اصول کو اپنی کتاب میں برتا ہو۔ اس مسئلے پر مثبت یا منفی دونوں میں کوئی بھی ایک رویہ اختیار کرنا ثبوت کے ساتھ مشکل ہے کیونکہ متعین طور پر ہمارے پاس ثبوت موجود نہیں ہے۔ ابن ندیم جس نے علم و فن اور علماء کی فہرست مرتب کی تھی وہ خود بھی وقت، مقام اور بشری کوتاہیوں کی بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ چوتھی صدی کا مصنف گزرا ہے۔ اس کے عہد سے تین صدی پیشتر کے دوران جو تصنیفی ترقیاں ہوئیں ان سب کا محفوظ رہنا لازمی نہیں ہے اور یہ تو بالکل قرین قیاس ہے کہ اگر وہ سب موجود بھی ہوں تو بھی ان سب تک کسی ایک مصنف کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں رسل و رسائل کے ذرائع میں اتنی زیادہ آسانی اور سہولت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ ابن ندیم کے لیے یہ آسان ہو سکتا کہ وہ سارے تاریخی مواد کو دستیاب کر سکے۔ تاہم اس کی یہ رائے خاصی باوزن ہے کہ ہیثم بن عدی کو اس خاص معاملے میں سبقت کی فضیلت

۱۔ یاقوت الحموی۔ معجم الادباء ج ۱۷ ص ۱۸۶۔۱۸۷

Marfat.com

حاصل ہے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ ہیثم نے ترتیب سن کے تحت سب سے پہلی تاریخی کتاب تصنیف کی تھی تو بھی یہ غور کرنا ہوگا کہ اس نے یہ اصول خود وضع کیا تھا یا اس کے پیش نظر کوئی نمونہ تھا جس کو دیکھ کر اس کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو۔ دراصل غور کیا جائے تو اس سوال پر کئی پہلوؤں سے غور کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہیثم بن عدی عربی زبان کے علاوہ سریانی یا یونانی زبان سے واقف تھا۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے جس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ممکن ہے اس نے عیسائی یا یہودی علماء کی ان تاریخی کتابوں کو دیکھا ہو جنہیں ترتیب سن کے تحت ان زبانوں میں تحریر کیا گیا تھا اور جو شام و مصر کے علمی مرکزوں میں پائی جاتی تھیں ـــــ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسی کتابوں کا یونانی یا سریانی زبانوں سے عربی زبان میں ترجمہ ہوا ہو جو فن تاریخ سے متعلق تھیں اور جن میں اس اصول کو برتا گیا ہو۔ اس سلسلے میں بھی ہمارے پاس کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے کہ بازنطینی تاریخ کی کسی کتاب کا عربی ترجمہ ہوا ہو! تاریخ کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کی شہادت تذکرے کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ رائے بھی قطعیت کے ساتھ نہیں قائم کی جا سکتی کہ کوئی ترجمہ شدہ کتاب نمونے کے طور پر اس کے کام آئی ہو۔ البتہ واقفیت کا ایک یعنی زبانی ذریعہ رہ جاتا ہے جو ممکن ہے اس نے کسی عیسائی عالم سے کہتے ہوئے سنا ہو کہ

(I) F. ROSENTHAL, A HISTORY OF MUSLIM HISTORIOGRAPHY – P 66.

Marfat.com

ترتیب سن کے تحت تاریخ کی کتاب یونانی اور سریانی زبانوں میں لکھی جاتی ہے۔ تاہم یہ صرف ایک امکان ہے جس کی بنیاد پر کوئی متعین رائے قائم کرنا مشکل ہے۔

اس مسئلے کے ان پہلوؤں کے علاوہ اس کا ایک اور بھی پہلو ہے۔ وہ یہ کہ کیوں نہ ہم اس تاریخی روایات کو محرک اور نمونہ تسلیم کر لیں جو فی الواقع آسانی سے ترتیب سن کے اصول کو وضع کرنے میں ذہن کو منتقل کر سکتی تھی۔ یعنی یہ کہ حضرت عمر کے عہد سے تاریخی واقعات و حوادث کو لکھتے وقت ماہ و سال کا ذکر کیا جانے لگا تھا اور جس پر ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد تاریخ نگاری کا فن زیادہ علمی اسلوب اختیار کرتا گیا۔ چنانچہ ایک ایسا وقت آیا کہ عربوں نے ترتیب سن کے اصول کا ادراک کر لیا اور اس کو اپنی کتابوں میں برتنے لگے۔ ہیثم کو تحریری شواہد کے مطابق اس ضمن میں سبقت حاصل ہوئی۔

بہر حال مذکورہ استدلال کی روشنی میں یہ بات طے ہو گئی کہ ترتیب سن کے اصولوں کو سب سے پہلے طبری نے نہیں بلکہ ان مورخین نے اختیار کیا تھا جو طبری سے پہلے گزر چکے ہیں۔ البتہ طبری وہ خوش قسمت مورخ ہے جس کی کتاب اسی اصول کے تحت لکھی جانے کے باوجود آج موجود بھی ہے۔ دیکھا جائے تو طبری نے اپنی کتاب میں دونوں اصولوں یعنی ترتیب زمانی اور ترتیب سن کو برتا ہے۔ آنحضرت کی ہجرت سے پہلے کے واقعات کو وہ ترتیب زمانی کے تحت درج کرتا اور بعد کے واقعات کو ترتیب سن کے ماتحت۔ ان دونوں صورتوں میں وہ وقت کی ترتیب کے ساتھ مختلف علاقوں، قوموں، خاندانوں اور بادشاہوں کی تاریخ ترتیب دیتا ہے۔ دراصل اگر یہ

کہا جائے کہ ابن جریر کی تاریخ الرسل والملوک عربوں میں تاریخ نگاری کے فنی اصولوں کی تکمیل کرتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

طبری نے واقعات کی ترتیب میں ایک جدت یہ پیدا کی ہے کہ کسی سال کے اندر جتنے اہم واقعات ہوئے ہیں انہیں پہلے بیان کرتا ہے مگر جو واقعات غیر اہم اور چھوٹے ہیں انہیں آخر میں درج کرتا ہے۔ اس نوعیت کے واقعات کی مثال زلزلوں، قحط، وغیرہ کی ہے۔ ابن جریر واقعات کو تقسیم بھی کرتا ہے مثال کے طور پر اگر کوئی واقعہ دو یا دو سے زائد سالوں میں مکمل ہوتا ہے تو وہ اس کے مطابق اس واقعے کو اتنے ہی سالوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے بیان کرتا ہے۔ اس انداز نگارش سے جہاں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مورخ کو واقعہ اور وقت کے مابین جو ربط ہے اس کا کس قدر سختی سے پابندی کرنے کا خیال ہے وہیں اس میں ایک خامی یہ منظر آتی ہے کہ واقعہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے سے اس کی پوری تصویر ذہن میں قائم کرنے میں پڑھنے والے کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال اس اصول کو آنے والے مورخین نے اپنایا اور اپنی کتابوں میں اس طریقے کو برتا ہے۔ البتہ بعض آنے والے مورخین نے دو ایک نکتوں میں اضافہ بھی کیا ہے۔ مثلاً ابن جریر نے غیر اہم واقعات کو آخر میں درج کیا لیکن اس کے لیے کوئی علیحدہ سرخی قائم کی ہے یعنی " ذکر من توفی ہذہ السنۃ "، اس عنوان کو ابن الاثیر نے تبدیل کرکے اس میں اور وسعت پیدا کی مثلاً " ذکر عدۃ حوادث فی ہذہ السنۃ "۔

ابن جریر نے واقعات کو بیان کرنے میں خواہ یہ کسی نوعیت کے ہوں سند کی پابندی کی ہے۔ ظاہر ہے فن تاریخ میں اس اصول کی پابندی سے یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ مواد غیر ضروری حد تک ضخیم ہو جاتا ہے۔ لیکن

Marfat.com

فی الواقع مصنف کے لیے اس کو ترک کرنا بڑا دشوار تھا کیونکہ ابن جریر نہ صرف ایک جلیل القدر مورخ تھا بلکہ وہ ایک بلند پایہ محدث بھی اور فن حدیث میں سند کا جو مقام ہے وہ ہم سب پر عیاں ہے۔ اس کو ختم کرنے کا مطلب علمی حلقوں بالخصوص طبقۂ محدثین کی طرف سے جس نوعیت کے ردعمل کا اندیشہ ممکن تھا بظاہر اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

تاریخ نگاری کے ان فنی اصولوں اور خصوصیات کو جنہیں عربوں نے دو ڈھائی صدیوں کے دوران پروان چڑھایا اور جس کی تکمیل ابن جریر کی تاریخ الرسل والملوک پر ہوئی آنے والے مورخین نے نہ صرف اپنایا بلکہ ان کے اندر جزوی اضافے بھی کیے مگر ظاہر ہے بنیادی طور پر اس ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اسی پر اپنی تصنیفات کی عمارت تعمیر کرتے رہے۔ اس مرحلے پر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر یہ مورخین جس مواد کو اپنی کتابوں میں جمع کرتے تھے۔ اس کے بارے میں ان کی کیا رائے تھی دوسرے لفظوں میں کیا وہ تاریخ کا کوئی تصور بھی رکھتے تھے۔

تاریخ کی تعریف اور اس کا کوئی واضح تصور عرب تاریخ نگاری کے ابتدائی عہد میں تلاش کرنا ایک دلچسپ کوشش سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل دیکھا جائے تو پرانی تاریخی کتابوں میں سے بہت کم ایسی ہیں جو آج کل موجود ہوں۔ پچھلے مباحث سے یہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عربوں کی باقاعدہ تاریخی دلچسپیوں کا آغاز عہد اسلام سے ہوتا ہے۔ انہوں نے سیرت مغازی، ایام والانساب، فتوح واحداث، انفرادی وخاندانی، شہری اور طبقاتی تاریخ لکھنے کا کام ساتویں صدی عیسوی کے آخری ربع سے شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے کا کوئی تاریخی سرمایہ تحریری طور پر ہمارے پاس موجود

Marfat.com

نہیں اور اگر ہو بھی جس تک میری رسائی نہیں ہوسکی تو بھی فی الحقیقت میرے زاویۂ نگاہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عربوں کے ابتدائی تاریخی نمونے اپنی اصلی اور مکمل صورت میں اگرچہ اب موجود نہیں جن کی مدد سے ہم مذکورہ سوالات پر متعین طور پر روشنی ڈالنے کے قابل ہوسکیں تاہم ہمارے پاس اُن قدیم اور ابتدائی نگارشات کے چیدہ چیدہ ٹکڑے ان کتابوں کے ذریعے پہنچے ہیں جن کا عہد تصنیف پہلی صدی کے آخری ربع سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہم خاص طور پر ابن اسحٰق کی مغازی کا نام لے سکتے ہیں جس کا خلاصہ سیرۃ ابن ہشام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اس کتاب کے اندر ابن اسحٰق سے پہلے جو مصنف گزرے ہیں ان کی تحریروں کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

ان ٹکڑوں کو پڑھنے سے براہ راست اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ان مورخین نے کہیں بھی تاریخ کی فنی تعریف کی ہو۔ اس موقع پر ہمیں اپنے طور پر یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ عہد میں تاریخ کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ فلسفۂ تاریخ پر کام کرنے والے مصنفین نے اپنے اپنے عہد، وسائل معلومات اور انفرادی ذہنی رجحانات کی پابندیوں کے ساتھ تاریخ کی جو تعریف کی ہے وہ الفاظ کے ردوبدل اور بعض اوقات فکری اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس کو واقعاتی قرار دیا ہے۔ مثلاً کسی نے تاریخ کو "واقعہ کا بیان" اور کسی نے اس کو "جو کچھ واقع ہوا ہے اس کا منظر" قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں تعریفوں میں ابہام پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے کسی قدر وضاحت سے اس کی یہ تعریف کی ہے کہ تاریخ "کسی ایک معاشرے کی سوانح حیات" ہے۔ یہ تعریف اپنی جامعیت میں مذکورہ دونوں تعریف سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کے دائرے میں کسی معاشرے کی مادی اور روحانی سرگرمیوں کے تمام پہلو

Marfat.com

شامل ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی یہ تعریف عرصہ تک عرب مورخین کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق تیسری صدی ہجری کے خاتمے سے ہے۔ اگر اس سے بھی زیادہ ابتدائی عہد کی کتابیں مکمل طور پر ہمارے پاس ہوتیں تو بھی یہ کہنا مشکل ہوتا کہ ان میں تاریخ کی تعریف مل سکتی۔ یوں تو دیکھا جائے خود فلسفہ ، تاریخ ایسا موضوع ہے جو عہد جدید کی پیداوار ہے جس کے دائرے میں تاریخ کی تعریف اور اس کا تصور آتا ہے۔

لیکن اس بات سے قطع نظر کہ تاریخ کی کوئی تعریف اصولی طور پر ابتدائی عہد میں نہیں پائی جاتی پھر بھی یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ اہلِ عرب تاریخ کے دائرے کا واضع شعور رکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخی کتابیں لکھتے وقت وہ نہ صرف سیاسی اور جنگی نوعیت ہی کے واقعات قلم بند کرتے تھے جو تاریخ کا بنیادی مواد سمجھا جاتا تھا بلکہ مذہبی عقائد انبیاء ورسل کی زندگی اور ان کے خیالات ، علماء وصلحاء کے دینی وروحانی تجربات ، ماتھالوجی ، علم ملائکہ اور علم الاصنام وغیرہ بھی اسی کے احاطے میں آجاتے تھے۔ ان تمام عناصر کا وجود عربوں کے ابتدائی تاریخی ادب میں پایا جاتا ہے جو رفتہ رفتہ وسیع تر تاریخی عناصر کو اپنے اندر سمو رہا تھا۔ چنانچہ سیرت ومغازی کا قدیم مواد جس کے ابتدائی نمونے عہد متاخر کی کتابوں میں محفوظ ہیں اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ان میں نہ صرف آنحضرت کے حالات درج تھے بلکہ دوسرے انبیاء ورسل کے بارے میں معلومات جمع کی گئی تھیں۔ اس کا مکمل نمونہ محمد بن اسحٰق کی کتاب تھی جو ان تمام خصوصیات کی حامل ہے جسے آگے چل کر عربوں کے لیے عالمی تاریخ نگاری کا نمونہ بننا تھا۔ لیکن تاریخ اور اس کے گہرے شعور کا بھرپور اظہار بڑی حد تک جس

Marfat.com

کتاب کے ذریعے ہوا اور جو آج بھی موجود ہے وہ ابن جریر کی تاریخ الرسل ہے ۔ اس کتاب میں اگرچہ تاریخ کی فنی تعریف واضح طور پر نہیں کی گئی ہے تاہم اس نے تقریباً ان تمام خصوصیات کو اپنی کتاب میں سمویا ہے جو تاریخ کی موجودہ تعریف کے ضمن میں آسکتی ہیں ۔

اس کتاب کے بعد جتنی اور تاریخی کتابیں اس نوعیت کی آئندہ عربی زبان میں لکھی گئیں ان سب کے فنی پہلوؤں میں ارتقاء ، وضاحت اور نکھار پیدا ہوتا رہا ۔

عربوں کے قدیم تاریخی ادب میں تاریخ کی تعریف اور اس کے دائرے کے تعین کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا وہ تاریخ کے کسی تصوّر سے بھی آشنا تھے ۔ انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی کہ آخر تاریخ ہے کیا ۔ یعنی واقعات حوادث ، حکومتوں کے بننے بگڑنے ، افراد کا عروج وزوال ، بادشاہوں اور امراء کی آمد و رفت ، غرضیکہ منظریات و افکار کا ابھرنا اور مقبول ہونا جو ظاہر ہے تاریخ کا موضوع ہیں یہ سب آخر کیوں ہوتا ہے ۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے بارے میں مورخین نے غور کرنا اور ان کا جواب تلاش کرنا بہت قدیم زمانے سے شروع کر دیا تھا ۔

مذکورہ سوالات کا دراصل زیادہ متعین طور پر جواب بالآخر اس مرکزی سوال سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان اس کائنات اور مخلوقات کے بارے میں کیا منظریہ قائم کرتا ہے ۔ کیا انسان ایک بااختیار ، آزاد اور مکمل حیثیت کا مالک ہے ۔ ظاہر ہے اس مسئلے پر آج بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان ، مجبور ، پابند اور خطاء کا پتلا ہے ۔ اس کا علم اب بھی محدود اور نامکمل ہے ۔ مورخین نے جو ان باتوں سے آگاہ تھے جب تاریخی واقعات کے اسباب اور ان کے

Marfat.com

علت غائی کی تعبیر کرنی چاہی تو انہیں ان کی تعبیر میں بالآخر یہی دشواری پیش آئی۔ البتہ ان سوالات کا ایک جواب مذہبی افکار نے دینے کی کوشش کی وہ یہ کہ جو کچھ ہوتا ہے ایک لافانی، ناقابل مسخر اور عظیم طاقت کی منشا سے ہوتا ہے۔ اس میں انسان کی اپنی عقل اور اختیار فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں انسان بالآخر اس طاقت کے ہاتھ کٹھ پتلی ہے وہ اس سے جو کام اور جس طرح لینا چاہتا ہے انسان اپنے آپ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر مجبور پاتا ہے۔ یہ تصور قدیم زمانے سے مسلسل طور پر انسان کے بعض بنیادی مسائل کے لیے تعبیر فراہم کرتا رہا ہے اور عہد جدید تک جب کائنات اور فطرت انسانی کا ایک نیا سائنسی اور میکانکی نظریہ ابھر کر سامنے آیا ہے اور جس نے انسان کے ماضی، اس کے کارناموں پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے اسی نظریے کی واضح طور پر مضبوط گرفت رہی ہے۔

کائنات اور انسان کے بارے میں مابعد الطبیعی تصور سے نکلے ہوئے ایک ایسے نظام اخلاق کو تسلیم کیا گیا جس کی حیثیت ایسے معیار کی تھی جو یکساں طور پر اور ہر زمانے میں انسانی عمل کو جانچنے پرکھنے اور اس کے انجام کی تعبیر کا کام دیتا رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تعبیر بہر صورت عقل اور انسانی تجربات کے معیاروں پر ہمیشہ پوری اترتی تھی۔ تاہم خیر و شر کے معروف معنوں کے پس منظر میں ان تاریخی واقعات کو دیکھا جاتا اور انہیں کو پرکھنے کا معیار سمجھا جاتا رہا ہے۔ عیسائی مورخین کے یہاں یہ رجحان نشاۃ ثانیہ سے پہلے غالب طور پر موجود تھا۔ اس طرح دنیوی حوادث کے پیچھے خالص مابعد الطبیعی عوامل کو کارفرما سمجھتے تھے۔ اس تصور کا جو منطقی نتیجہ ہوتا ہے اس سے وہ کہاں تک آگاہ تھے۔ یہ تفصیل طلب مطالعہ کا موضوع ہے، کیونکہ انسان کی عقل

اور اس کے ارادے کو بالکلیہ ایک ماورائی قوت کے تابع مان لینے کا مطلب انسان سے اس کی فکری و عملی آزادی کو چھین لینا ہے۔

مسلم مورخین کی کتابوں کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بڑی اکثریت تاریخی حوادث اور فی الجملہ تاریخ کے بارے میں یہی مابعد الطبیعی نظر رکھتی تھی۔ اس سلسلے میں اس نکتے پر تھوڑا بہت جو بھی مواد موجود ہے اس کو پڑھنے سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ابن جریر کے وہ تمہیدی جملے جو اس نے اپنی تاریخ کے شروع میں تحریر کیے ہیں ان سے مجمل طور پر اس کے منظریہ تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "انبیاء و رسل کی طرح بادشاہ و خلیفہ کا انتخاب بھی اللہ کی طرف سے مقدر ہے اور یہ ان پر خدا کا بڑا فضل ہے"[1]۔ سلاطین و امراء کے انتخاب اور ان کے عروج و زوال کے پس پردہ منشاء الٰہی کو تسلیم کرنے کا خیال دراصل وہ غالب رجحان ہے جو ہم کو اس عہد کے مورخین کے یہاں بنیادی خصوصیت کے طور پر نظر آتا ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ اس عہد کی سیاسی قوت کا اندازہ ہی ایسا تھا کہ تاریخ کے بارے میں اس مذہبی رجحان کو تسلیم کیا جاتا رہا بلکہ اس قوت کے ذریعے اس کی تائید بھی ہوتی رہی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ تیسری صدی ہجری کی وہ عقلی اور علمی فضا بھی جس کے زیر اثر دیگر علوم عقلیہ نے غیر معمولی ترقی کی تھی اس کا تاریخ نگاری کے اس رخ پر کوئی اثر بھی نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس سارا زور اور پوری محنت اس فن کی ہیئت اور مواد کے انتخاب، تنقید و تجزیہ اور اس کے نوک و

۱۔ ابن جریر الطبری، تاریخ الرسل والملوک، ج ۱، ص ۵

پلک درست کرنے میں مصروف نظر آتی ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد نہ صرف عرب تاریخ نگاری کے فن کو بلکہ اس میدان میں عالمی سطح پر ابن خلدون جیسا فلسفی مورخ ملا جس نے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔

Marfat.com

کتابیات

۱۔ ابن الاثیر — تاریخ الکامل ج ۱-۶-۸ مصری ایڈیشن

۲۔ ابن الاثیر — اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ج ۱ طبع تہران ۱۳۴۲ھ

۳۔ ابن جریر الطبری — تاریخ الرسل والملوک ج ۱-۱۲ طبع برل ۱۸۷۹-۱۸۸۸

۴۔ ابن الجوزی — صفۃ الصفوۃ ج ۲ طبع حیدرآباد ۱۳۵۵ھ

۵۔ ابن حجر العسقلانی — تہذیب الاسماء جلد ۱

۶۔ ابن حجر العسقلانی — الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ طبع کلکتہ ۱۸۵۶ اسپرنگر

۷۔ ابن حجر العسقلانی — تہذیب التہذیب ج ۳، ۴، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱
طبع حیدرآباد، ۱۳۳۵

۸۔ ابن حجر العسقلانی — لسان المیزان ۔ حیدرآباد ۱۳۲۹

۹۔ ابن حزم — جمہرۃ انساب العرب طبع قاہرہ ۔ ۱۹۴۸

۱۰۔ ابن خلکان — وفیات الاعیان، ج ۲، ۳، ۵ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۴۸

۱۱۔ ابن الخطیب — تاریخ بغداد ج ۱، ۳، ۱۲، ۱۴ ۔ مطبعۃ السعادۃ، ۱۹۳۱

۱۲۔ ابن سید الناس — عیون الاثر ج ۱، ۲ مکتبۃ القدسی ۱۹۵۶

۱۳۔ ابن سعد — طبقات ابن سعد ج ۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۸
طبع برل ۱۹۰۵ سخاؤ۔

Marfat.com

۱۴۔ ابن العماد — شذرات الذہب — ج ۱، ۲

۱۵۔ ابن قتیبۃ الدینوری — کتاب اخبار الطوال۔ لائڈن۔ ۱۸۸۸

۱۶۔ ابن قتیبۃ الدینوری — کتاب المعارف

۱۷۔ ابن قتیبۃ — عیون الاخبار ج ۱، ۲، ۳ — بروکلمان

۱۸۔ ابن کثیر — البدایۃ والنہایۃ ج ۱۱ مطبعۃ السعادۃ ۱۹۳۲

۱۹۔ ابن ندیم — کتاب الفہرست — لائڈن ۱۰۷۲

۲۰۔ ابن ہشام — سیرۃ ابن ہشام ج ۱، ۲، ۳ مطبعۃ مصطفی البابی ۱۹۵۵

۲۱۔ ابوعبداللہ معصب الزبیری — کتاب نسب قریش — لیفتی پروفنسال ۱۹۵۳

۲۲۔ ابونعیم — حلیۃ الاولیاء — ج ۲، ۳

۲۳۔ ابویوسف — کتاب الخراج — المطبعۃ السلفیۃ ۱۳۵۲

۲۴۔ الازرقی — اخبار مکۃ ج ۱ — وستنفیلد ۱۲۷۴ھ

۲۵۔ اصفہانی — کتاب الاغانی ج ۱، ۳، ۴، ۹، ۱۶ بیروت ۱۹۵۵

۲۶۔ بلاذری — فتوح البلدان۔ المطبعۃ المصریۃ ۱۹۳۲

۲۷۔ بلاذری — انساب الاشراف ج ۵ — یروشلم ۱۹۳۶

۲۸۔ ثعالبی — غرر اخبار ملوک الفرس وسیرہم — پیرس ۱۹۵۵

۲۹۔ جواد علی — تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۱، ۲، ۳ بغداد ۱۹۵۲

۳۰۔ حاجی خلیفہ — کشف الظنون ج ۲ ۱۸۳۵ لنڈن

۳۱۔ حسین نصار — نشأۃ التدوین التاریخی عند العرب۔ قاہرہ

۳۲۔ حمزۃ الاصفہانی — تاریخ سنی ملوک الارض۔ کلکتہ ۱۸۶۹

۳۳۔ خیرالدین الزرکلی — الاعلام — ۱۹۵۴ - ۱۹۵۹

۳۴۔ ذہبی — تذکرۃ الحفاظ ج ۱، ۲ — حیدرآباد ۱۳۳۴ھ

۳۵۔ ذہبی — تراجم الرجال — یورپین ایڈیشن ۱۸۹۰ء

۳۶۔ ذہبی — سیر اعلام النبلاء ج ۳ — ۱۹۵۷

۳۷۔ ذہبی — میزان الاعتدال ج ۳

۳۸ سبکی — طبقات الشافعیہ ج ۲

۳۹۔ سخاوی — الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ۔ بغداد ۱۹۶۳

۴۰۔ سیوطی — بغیۃ الوعاۃ، مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۶ھ

۴۱۔ طاش کبری زادہ — مفتاح السعادۃ ج ۱ حیدرآباد ۱۳۵۶ھ

۴۲۔ عبدالعزیز الدوری — بحث فی نشاۃ التدوین التاریخی عند العرب، بیروت ۱۹۶۰

۴۳۔ عبید بن شریہ — اخبار عبید، حیدرآباد

۴۴۔ محمد بن یزید المبرد — نسب عدنان و قحطان — ۱۹۳۶

۴۵۔ محمد حمدی — کتاب الآن والآئین۔ ۱۹۶۳ بیروت

۴۶۔ محمد بن اسماعیل البخاری — تاریخ الکبیر ج ۱ حیدرآباد ۱۳۶۱ھ

۴۷۔ مسعودی — مروج الذہب ج ۱ [illegible]

۴۸۔ مسعودی — التنبیہ والاشراف — بریل ۱۸۹۳ء

۴۹۔ نولڈیکے — فہرست طبری — بریل ۱۹۰۱

۵۰۔ واقدی — کتاب المغازی کلکتہ وان کریمر ۱۸۵۶

۵۱۔ ہمدانی — کتاب الاکلیل ج ۸، ۱۰ پرنسٹن ۱۹۴۰

۵۲۔ یافعی — مرآۃ الجنان ج ۱، ۲ حیدرآباد ۱۳۳۷

۵۳۔ یاقوت الحموی — معجم الادباء ج ۱۴، ۱۹ مکتبہ عیسیٰ البابی

۵۴۔ یاقوت الحموی — ارشاد الاریب ج ۱، ۲، ۶، ۷۔ مارگولیتھ ۱۹۰۷

۵۵۔ یعقوبی — تاریخ یعقوبی ج ۱، ۲ بیروت ۱۹۶۰ء

Marfat.com

انگریزی کتب

1-	ENCY. OF ISLAM	VOL. 1. 2. 3. 4
2-	O' LEARY	ARABIA HEFARE MOH-AMMAD.
3-	O' LEARY	HOW GREEK SCIENCE AND THOUGHT PASSED TO THE ARABS.
4-	BROCKELMANN.	SUPPL VOL. I
5-	BROCKELMANN.	G. VOL. 1
6-	H.R. GIBB.	STUDIES ON THE CIVILIZATION OF ISLAM.
7-	WELI HAMAEN.	THE ARAB KINGDOM AND ITS FALL.
8-	SHORTER ENCY. OF ISLAM.	
9-	F. ROSENTHAL.	A HISTORY OF MUSLIM HISTORIOGRAPHY.

Marfat.com

10- WILL. DURANT. THE STORY OF CIVILIZATION VOL. 4

رسالے

1- ISLAMI CULTURE. HYDERABAD. 1927-1928.

۲ - المجمع العلمی العراقی۔ موارد تاریخ الطبری، ۱۹۵۱، ۱۹۵۲، ۱۹۵۵ء

محمد عابدی
ذخیرہ

Nizami Book Agency
BUDAUN - 243601 (U.P.)

Marfat.com

نئی اور اہم مطبوعات

رموزِ غالب	ڈاکٹر گیان چند	۱۸/۵۰
میرانیس سے تعارف	صالحہ عابد حسین	۴/-
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	۱۰/۵۰
جدید اردو ادب	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نرائن ملّا	۱۶/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا	عمور الحسن	۱۵/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبد اللطیف اعظمی	۱۲/۵۰
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۴/-
نیا اردو نصاب (اول)	مرتبہ: محمد ذاکر	۳/-
نیا اردو نصاب (دوم)	مرتبہ: قیصر زیدی، محمد ذاکر	۳/-
پچھلے پہر	جاں نثار اختر	۷/-
بیاضِ مریم	سکندر علی وجد	۱۲/-
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
مغلیہ ہندوستان میں زرعی تعلقات	سید نور الحسن	۴/-
سماجی تبدیلیاں ازمنۂ وسطیٰ کے ہندستان میں	رام شرن شرما	۲/-
قدیم دِلّی کالج	مالک رام	۴/۵۰
انتخاب حالی	مرتبہ: سفارش حسین رضوی	۶/۵۰
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	۱۸/-
تلاش مہتر	نثار احمد فاروقی	۱۱/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
مذہب اور جدید ذہن	ڈاکٹر مشیر الحق	۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
جانے والوں کی یاد آتی ہے	صالحہ عابد حسین	۱۸/-
مسرت سے بصیرت تک	آل احمد سرور	۱۲/۵۰
وہ صورتیں الٰہی	مالک رام	۱۰/-
دین الٰہی اور اس کا پس منظر	محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۱۲/۵۰
ہمارے ذاکر صاحب	رشید احمد صدیقی	۹/-
طنزیات و مضحکات	رشید احمد صدیقی	[illegible]۵۰

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج دہلی

6430

Marfat.com

غزلوں میں تاریخ نگاری

کا آغاز و ارتقا

محمود الحسن

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

Marfat.com